مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

شمارہ ۸	شوال ۱۴۳۵ھ / اگست ۲۰۱۴ء	جلد ۱۵

تاسیس البنیان علی تقویٰ من اللہ ورضوان

مساجد و مدارس و دیگر تعمیرات کا حکم

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/ ۲۰ روپے زرسالانہ =/ ۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت
جامعۃ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

(تاسیس البنیان علی تقویٰ من اللہ ورضوان)

(مساجد ومدارس ودیگر تعمیرات کا حکم)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	T	۱۰
۲	اعمال باطنیہ	۱۱
۳	احکام شرعیہ کے مخاطبین	۱۲
۴	اعتدال شریعت	۱۳
۵	اعتراض کا جواب	۱۳
۶	سہولت احکام	۱۴
۷	علم ضروری	۱۵
۸	احکام شریعت میں تنگی کا اشکال	۱۶
۹	تنگی اور پریشانی کی وجہ	۱۷
۱۰	اہل اللہ کا حال	۱۹
۱۱	احکام شریعت کی تنگی کی مثال	۲۰
۱۲	مدارس پر اعتراض کی حقیقت	۲۱
۱۳	مساجد کی عدم خبر گیری	۲۳
۱۴	حضرت تھانوی کی احتیاط	۲۴

۱۵	سفارش کی خرابیاں	۲۴
۱۶	حضور ﷺ کی تبلیغ اسلام	۲۷
۱۷	نااہل کو منتظم یا مہتمم بنانا	۲۸
۱۸	حکیم الامت کا حکیمانہ جواب	۲۹
۱۹	بے ریاء ہدیہ	۳۰
۲۰	کام کی برکت	۳۱
۲۱	چندہ مدرسہ کے لئے حضرت تھانوی m کا معمول	۳۲
۲۲	تعمیر مسجد میں ایک بزرگ کا کردار	۳۳
۲۳	سادگی اور جاذبیت	۳۴
۲۴	خودداری کا تقاضا	۳۶
۲۵	اہل مدارس کو نصیحت	۳۷
۲۶	حضرت تھانوی کی خودداری	۳۷
۲۷	علماء اور ترقی	۳۸
۲۸	شان علماء	۳۹
۲۹	حصول چندہ میں حضرت تھانوی m کی احتیاط	۴۰
۳۰	خیرات مقصود	۴۱
۳۱	طاعت اور توفیق	۴۲

۳۲	زکوٰۃ نہ دینے کا وبال	۴۴
۳۳	بقاء علم کی صورت	۴۵
۳۴	حکایت	۴۵
۳۵	ضرورت مدارس	۴٦
۳٦	مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ	۴۷
۳۷	قرآنی طرز نصیحت	۵۱
۳۸	حضرت تھانوی m کا اندازِ نصیحت	۵۲
۳۹	اصلاح احوال کے طور طریقے	۵۴
۴۰	تعمیری بنیاد	۵۵
۴۱	مکان کی اہمیت	۵٦
۴۲	مکان کی قدر	۵۷
۴۳	قوم عاد کی تقلید	۵۸
۴۴	اہل فتاویٰ کی غلطی	۵۹
۴۵	اقسام مساجد	٦۰
۴٦	مدرسے اور کھالیں	٦۱
۴۷	تعمیر مساجد اور احتیاط	٦۳
۴۸	مکان اور تقویٰ	٦٦

۴۹	مکان اور ضرورت	۶۸
۵۰	معیارِ ضرورت	۶۹
۵۱	آسائش و آرائش	۶۹
۵۲	عشق اور وظیفہ	۷۰
۵۳	حصولِ عشق الٰہی کا طریقہ	۷۱
۵۴	بزرگوں کی سختی	۷۲
۵۵	تواضع اور رحم کا فقدان	۷۴
۵۶	تواضع کی حقیقت	۷۵
۵۷	بزرگوں کی تواضع	۷۵
۵۸	بزرگوں کی شانیں مختلف ہیں	۷۶
۵۹	عبادات اور نخوت	۷۷
۶۰	عشق پیدا کرنے کی تدبیر	۷۸
۶۱	تعمیر میں خلوص کا اثر	۷۹
۶۲	قلب اور موت	۸۱

t

وعظ

(تأسیس البنیان علی تقویٰ من اللّٰہ ورضوان)

(مساجد ومدارس ودیگر تعمیرات کا حکم)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے احکام وآداب عمارات کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذوالحجہ سنہ ۱۳۲۵ھ کو کاندھلہ میں کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔ مولوی اشفاق صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حاضرین کی تعداد ۱۵۰ کے قریب تھی۔

مساجد ومدارس کی تعمیر اور حصول چندہ میں احتیاط کی خصوصی طور پر تاکید فرمائی اہل مدارس اور منتظمین مساجد کے لئے خصوصا اور دیگر لوگوں کے لئے عموما انتہائی مفید مضامین ذکر کئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب پڑھنے والوں کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں۔

خلیل احمد تھانوی

۹ جمادی الاول ۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○﴾(۱)

''پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا اور خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ میں جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو پھر اس کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی ہاں مگر ان کے دل ہی فنا ہو جائیں تو خیر اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں''۔

(۱) سورۃ التوبہ:۱۰۹،۱۱۰۔

T

یہ دو آیتیں ہیں جن میں ایک خاص مضمون ایک خاص موقع کے مناسب مذکور ہے مگر مجھے اس سے ایک عام مضمون بیان کرنا ہے۔ لیکن اس بناء پر اس خاص مضمون کی آیات کا تلاوت کرنا بیکار اور زائد نہ سمجھا جائے نیز اس خاص مضمون سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ کل جو بنیاد مدرسہ کی رکھی ہے اس کے متعلق وعظ ہوگا۔ اور تحریک چندہ (۱) کے لئے وعظ ہوگا۔ ایسا خیال محض غلط خیال ہے اس لئے کہ میں یہ مضمون بیان نہ کروں گا اور نہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو دینا ہوگا خود ہی دے گا۔ مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ میں اس وقت ایک دوسرا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔ گو یہ آیت خاص ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے مگر اس وقت ایک دوسرا مضمون بیان کرنا مقصود ہے اور وہ مدنظر نہیں ہے بلکہ ایک عام مضمون بیان کرنا ملحوظ خاطر ہے (۲) گو وہ زیادہ عام بھی نہیں جس کا تعلق تمام حالات سے ہو بلکہ ایسا عام اس خاص کے اعتبار سے ہے۔ اس میں ایک درجہ کا ایسا عموم ہے کہ اکثر لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے یعنی آیات تو خاص مساجد کے احکام کے متعلق ہیں اور میں ذکر کروں گا عام عمارات کے متعلق۔ جس کا عموم بھی بہ نسبت خاص عمارات مساجد کے ظاہر ہے اور جس سے بکثرت لوگوں کو سابقہ بھی پڑتا ہے۔ مگر جن بعض لوگوں کو مطلقاً عمارات سے سابقہ نہیں پڑتا ان کے لئے عام نہیں پس یہ کہنا صحیح ہوگیا کہ عام تو ہے مگر زیادہ عام بھی نہیں ہے۔ تفصیل اس عموم و خصوص اور اس کے اعتبار سے درجات ضرورت کے تفاوت کی یہ ہے (۳) کہ مخاطب عام مکلفین (۴) ہیں۔ اور ان سے سب کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض

(۱) چندہ مانگنے کے لئے (۲) پیش نظر ہے (۳) اس عام اور خاص اور اس کے درجات ضرورت میں یہ فرق ہے (۴) عام لوگ ہیں جو پابند احکام ہیں۔

مضامین وہ ہیں جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض کو نہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں جن سے اکثر کو سابقہ پڑتا ہے گو قدر قلیل کو نہ پڑتا ہو۔ اور جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہو نہ کہ اکثر کو وہ اس درجہ کے اہتمام کے لائق نہیں۔

اس میں اصل کلیہ یہ ہے کہ احکام تابع واقعات کے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق کچھ احکام شرعیہ ہیں۔ جس کو وہ واقعہ پیش آوے اس کو وہ احکام سیکھنا فرض اور ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے احکام ہیں کہ ملک مال(۱) سے متعلق ہیں جب تک آدمی مال کا مالک نہ ہو اس وقت تک اس کو احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا فرض اور ضروری نہیں۔ گو اعتقاد فرضیت کا فرض ہے اور جب مال کا مالک ہوا اس وقت احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا ضروری اور فرض ہو گئے۔ اور احکام عملیہ کی قید اس لئے لگائی کہ عقیدہ کے درجہ میں تو ہر شخص سے زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ کا تعلق ہے جیسا اوپر بیان ہوا مگر عمل کے درجہ میں ہر شخص سے نہیں بلکہ اسی شخص سے ہوگا جس کے پاس بقدر نصاب مال ہو(۲) اور عملی سے بھی مراد عمل ظاہری ہے نہ کہ عمل باطنی کیونکہ عمل باطنی کا بھی ہر شخص سے تعلق ہے جیسا عنقریب آتا ہے۔

اعمال باطنیہ

ہر چند کہ عمل باطنی کو آج کل عمل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اعمال باطنی بھی ضروری ہیں (بلکہ اس وجہ سے اعمال باطنیہ زیادہ ضروری ہیں کہ ان پر ہی مدار قبول اور عدم قبول کا ہے اور نیز اعمال باطنیہ کا تعلق بحسب العمل سب سے ہے) مثلاً زکوٰۃ کے اندر اعمال باطنی یہ ہے کہ یہ عزم ہو کہ اگر مال ہوا تو میں زکوٰۃ دوں گا۔ یہ

(۱) مال کا مالک ہونے سے متعلق ہیں (۲) ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر ضرورت اصلیہ سے زائد جس کی مِلک میں ہو وہ صاحب نصاب ہے۔

عمل باطنی ہے تو یہ عمل ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا تعلق ہر شخص سے ہے۔ اس مفلس کو جو مالدار نہ ہو یہ عزم رکھنا ضروری ہے کہ اگر میں مالدار ہوا تو زکوٰۃ دوں گا اور یہ فرض ہے اور اگر یہ عزم نہ کرے یا یہ عزم کرے کہ میں اگر مالک مال ہوا تو زکوٰۃ نہ دوں گا۔ تو اس سے گنہگار ہوگا۔ کیونکہ اس نے ایک عمل باطنی فرض کو ضائع کیا۔ غرض یہ عزم عمل باطنی ہے اور ضروری وفرض ہے اور اس عمل کا ہر شخص سے تعلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض احکام باعتبار عمل ظاہر کے وہ ہیں جن کا تعلق سب سے نہیں بلکہ بعض سے ہوتا ہے۔ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی خاص ہے کہ جس کو تعلق بعض اعمال ظاہرہ سے ہے اعمال باطنہ سے نہیں، جس کا ہر ہر فرد مکلّف انسان سے تعلق ہوتا۔ اس وجہ سے ایسا تو عام نہیں ہے جیسا کہ عمل باطنی یا بعض عمل ظاہری عام ہوتا ہے۔ اور نہ ایسا خاص ہے جیسا کہ بعض احکام ظاہرہ مخصوصہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا یہ مضمون بہ نسبت عمل باطنی وبعض ظاہری کے تو خاص ہے۔ اور بلحاظ عمل ظاہری خاص کے عام ہے کہ سب سے تعلق نہیں صرف اکثر سے تعلق ہے۔ چنانچہ آیت سنتے ہی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ وہ عمل جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مکان بنانا اور تعمیر کرنا ہے۔ سو اس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔

احکام شرعیہ کے مخاطبین

اور ان احکام کے وہی مخاطب ہوں گے جن کو تعمیر کا اتفاق پیش آتا ہے اور جن کو کبھی ایسا اتفاق ہی پیش نہیں آیا اور انہوں نے کبھی اینٹ بھی نہیں رکھی، ان لوگوں سے ان احکام کا تعلق نہ ہوگا۔ جیسے جو شخص مالک مال نہ ہو اس سے احکام زکوٰۃ کا تعلق نہیں۔ اسی طرح سفر حج کے احکام ہیں۔ یہ احکام بھی اسی شخص سے

متعلق ہوں گے جس پر حج فرض ہے۔ اسی طرح وہ احکام ہیں جن کا وہاں جانے کے بعد سیکھنا اور معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے احکام طواف احکام عمرہ، احکام احرام، احکام رمی وغیرہ اور جس شخص پر حج فرض نہیں اسے ہنوز احکام حج سیکھنا فرض نہیں۔ اور جن کے ذمہ فرض نہیں ہے مگر وہاں پہنچنے سے فرض ہو جاتا ہے اس وقت ان کو بھی احکام سیکھنا فرض ہوں گے۔

اعتدال شریعت

سبحان اللہ! شریعت بھی نہایت اعتدال اور سہولت کا اور جامع قانون ہے۔ چنانچہ جامعیت کی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر مشاغل کثیرہ ہیں کہ ہر شخص کے بے حد وحساب مشاغل ہیں مگر قانون شریعت سب کو محیط ہے کوئی جزئی قانون شریعت سے خارج نہیں عادۃً اس قدر مشاغل کثیرہ پر کسی قانون کا احاطہ تامہ (۱) سخت دشوار تھا۔ یہی بڑی دلیل ہے قانون شریعت کے من جانب اللہ ہونے کی)(۲) اور اسی طرح سے کسی شخص نے نکاح نہ کیا ہو اور نہ ارادہ نکاح کا ہو۔ اس پر احکام نکاح سیکھنا ضروری نہیں اور جس وقت نکاح کا ارادہ کرے اس وقت احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہے۔

اعتراض کا جواب

اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ احکام شرعیہ کا معلوم کرنا اس طرح سے فرض ہو تو شریعت میں بے حد تنگی اور حرج لازم آوے گا کیونکہ ایک عمل کے متعلق بہت بہت احکام ہیں جن کا مجتمعاً حاصل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ حالانکہ قرآن میں صاف واضح طور پر موجود ہے وما جعل علیکم فی الدین من حرج

(۱) کسی قانون کا اتنے مختلف شعبوں کا احاطہ مشکل ہے (۲) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے۔

’’تمہارے اوپر دین میں کچھ تنگی نہیں ڈالی‘‘ جس سے بین طور پر (۱) ثابت ہو رہا ہے کہ دین میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اس وقت ہوتا کہ ایک وقت میں تمام احکام کا علم واجب ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر بدیہیات (۲) سے ہے کہ سب احکام کا ایک وقت میں محفوظ کرنا سخت دشوار ہے مگر ایسا نہیں بلکہ جس وقت جس عمل کی ضرورت ہو اس وقت اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ لہذا روز روشن کی طرح معلوم ہوگیا کہ حرج علمی بھی دین میں نہیں۔ اور حرج تنگی نہ ہونا تو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں اعمال کا اجتماع نہیں ہوتا۔ ایک ایک وقت میں ایک ایک عمل ہے اور وہ بھی بہت سہل اور کوئی حکم دشوار نہیں۔

سہولت احکام

تمام احکام سہولت پر مبنی اور بے حد سہل ہیں (۳)۔ باقی اگر خود ہی کوئی شخص دشوار (۴) سمجھنے لگے اور عہدی (۵) بن جاوے اس کا علاج نہیں ورنہ کسی کام میں بھی تو مصیبت اور تنگی نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے اگر کسی شخص کو قیام پر قدرت نہ ہو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اس کے لئے حکم ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی قدرت نہ ہو (۶) تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو اور اس کو رمضان کے روزے پر قدرت نہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ اور ایام میں رکھ لے (۷) اور اگر یہ یقین ہو کہ اب مجھے عمر بھر قدرت نہ ہوگی تو فدیہ دے دے اور اگر فدیہ پر بھی قدرت نہ ہو تو استغفار کرے۔

---

(۱) واضح طور پر ثابت ہوتا ہے (۲) بالکل واضح ہے (۳) آسان (۴) مشکل (۵) سست وکاہل (۶) کھڑے ہونے پر قادر نہ ہو (۷) رمضان کے بعد جب اچھا ہو جائے رکھ لے۔

علم ضروری

غرض اسی طرح سے احکام میں تشقیق و تفصیل ہے(۱)۔ جو محض سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے تو دین پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔ اسی طرح جو شخص نکاح کا ارادہ کرے اس پر نکاح کے احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہیں مگر اس وقت وہی احکام فرض ہوں گے کہ جو وقت تزوج کے ہیں(۲)۔ طلاق کے احکام اس وقت سیکھنے فرض نہ ہونگے کیونکہ نکاح بہ نیت طلاق موجب معصیت ہے(۳) یعنی اس نیت سے نکاح کرنا کہ میں طلاق دے دوں گا موجب گناہ ہے۔ اور اس نیت سے گناہ ہوتا ہے البتہ نکاح ہوجاوے گا مگر گناہ ضرور ہوگا۔ اور نکاح نافذ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زنا کا گناہ نہ ہوگا۔ بہرحال جب یہ عزم اور یہ ارادہ معصیت ہوا تو یہ ارادہ نہ کیا جائے گا کہ طلاق دوں گا اور جب یہ ارادہ نہ ہوگا تو تزوج کے وقت احکام طلاق کا سیکھنا ضروری اور فرض بھی نہ ہوگا البتہ جب عزم طلاق ہو، اس وقت احکام طلاق سیکھنے فرض ہونگے کہ طلاق کس وقت دینی چاہئے۔ طہر میں یا حیض میں(۴) اور کیسے دینی چاہئیں۔ مثلاً تین طلاق دفعۃً دینی چاہئیں یا متفرق طور سے(۵)۔ پھر جب طلاق موافق سنت دے دی تو اب یہ احکام سیکھنے ضروری ہیں کہ یہ طلاق رجعی ہوئی یا بائن(۶) اور عدت کے احکام دیکھنے لازم ہوں گے کہ عدت میں نفقہ ضروری ہے یا نہیں تو ان احکام کا اس وقت سیکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ پس اسی طرح یہ مضمون مقصود بالبیان بھی اسی قسم سے ہے کہ اس کی ہر شخص کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکان تعمیر کرنے کا

---

(۱) اسی طرح احکام میں بھی مختلف شقیں اور تفصیلات ہیں (۲) نکاح کے وقت کے ہیں (۳) طلاق دینے کی نیت سے نکاح کرنا گناہ ہے (۴) عورت کو پاکی کے زمانے میں طلاق دے یا ناپاکی کے زمانے میں (۵) تین طلاق اکٹھی دے یا الگ الگ (۶) یعنی اس طلاق کے بعد رجوع ہوسکتا ہے کہ نہیں۔

ہر شخص کو سابقہ نہیں پڑتا ہے شوق اور خبط تقریباً عام طور پر سب کو تعمیر مکانات کا ہے الا نادراً(۱) چنانچہ جو لوگ مکان بناتے ہیں اگر ان کو گنجائش نہی بھی ہوتی تب بھی اپنی وسعت سے زیادہ صرف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک اگر حوصلہ سو کا ہے تو پانچ سو خرچ کر کے پریشان ہوتے ہیں۔غرض تعمیر مکان کی تمام شخصوں کو حاجت نہیں ہے البتہ اکثر کو بے شک ضرورت ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہیں کہ جن کو تعمیر مکان کی حاجت نہیں ہے۔ زیادہ وہی ہیں جن کو ضرورت ہے پکا نہ سہی تو کچا سہی اور لحاظ زیادہ افراد کا ہوا کرتا ہے۔اس لئے کہ للاکثر حکم الکل (۲) اس لئے اگر کوئی شخص اس مجمع میں ایسا ہو کہ اس کو تعمیر مکان کی حاجت نہ ہو تو اس کی رعایت سے اس وقت اس بیان کو چھوڑا نہ جائے گا کیونکہ النادر کالمعدوم (۳)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ مضمون یعنی تعمیر مکان کا اکثر کے متعلق ہے اور چونکہ اس کے آداب اور شرائط معلوم نہیں اور ہم خود مختار ہیں نہیں اور کچھ احکام ہم پر اس کے متعلق بھی ہیں اس لئے ان احکام کے بتلانے کی ضرورت ہے۔

احکام شریعت میں تنگی کا اشکال

اس سے بعضے جہلا یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے کہ ہر چیز کے احکام ہیں کہ اس طرح کھاؤ اور اس طرح پیئو۔تمام چیزوں کے قواعد بنا دیئے ہیں بلکہ مزید برآں فی زمانہ بہت لوگ تو احکام شرعیہ کو مولویوں کی گھڑت خیال کرتے ہیں۔ خداوندی حکم بھی خیال نہیں کرتے اور جو خداوندی احکام خیال کرتے ہیں وہ ان احکام میں تنگی سمجھتے ہیں حالانکہ احکام میں بے حد سہولت ہے اور حیرت تو یہ

(۱) مگر بہت کم ہوں گے جن کو شوق نہ ہو (۲) اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ جس کی ضرورت اکثر کو ہوتی ہو تو کہا جائے گا کہ سب کو ضرورت ہے (۳) جو کم ہو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہے کہ گمان یہ ہوگیا ہے کہ احکام تنگی کے واسطے موضوع ہیں [۱]۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کے واسطے مسہل [۲] کا نسخہ تجویز کرے مگر مریض اس مسہل کی غایت [۳] پر نظر نہ کرکے اس کے ذائقہ کی تلخی دیکھ کر طبیب کو برا بھلا کہنے لگے۔ تو جیسے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر بھی حیرت ہے جو دین کے احکام کو تنگی کے واسطے موضوع قرار دے۔ چنانچہ ہر شخص ہر مریض کی باتوں کو سن کر یہی کہے گا کہ اس مریض نے غایت پر نظر نہیں کی۔

صاحبو! مسہل کی ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک مواد فاسدہ دفع ہوکر قوت عود نہ کرے [۴] اور جب مواد دفع ہوجاوے گا اور دو میل تک تفریح کے لئے بے تکلف جاسکے گا اور فرحت اور تازگی پیدا ہوگی جو پہلے نہ تھی اس وقت مجوز مسہل کی [۵] قدر ہوگی کہ واقعی طبیب بہت شفیق تھا جس نے غایت شفقت سے مسہل دے کر مواد فاسدہ کو دفع کردیا [۶]۔ اسی طرح سے احکام شرعیہ کی حالت ہے جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کو عمر بھر کبھی تنگی اور پریشانی پیش نہیں آتی بلکہ وہ بے حد راحت میں رہتے ہیں۔ اس مضمون کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ ہم تو اہل اللہ کو بھی تنگی اور مصیبت میں دیکھتے ہیں وہ راحت میں کہاں ہیں تو اصل یہ ہے کہ معترض تنگی و پریشانی کو ذات واقعہ کی صفت اور اثر خیال کرتا ہے حالانکہ یہ اسکا محض خیال ہی ہے۔

تنگی اور پریشانی کی وجہ

حقیقت میں تنگی اور پریشانی ذات واقعہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے

(۱) احکام تنگی کے لئے بنائے گئے ہیں (۲) دست آور دوا تجویز کرے (۳) اس دواء کی تجویز غرض کو نہ سمجھے (۴) جب تک خراب مادہ دور ہوکر قوت نہ پیدا ہوجائے (۵) دستوں کی دواء تجویز کرنے والے کی قدر ہوگی (۶) فاسد و خراب مادے کو دور کردیا۔

عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ جزئیہ ہے کسی کو بغل میں دبالینا۔ سو اس کے متعلق ایک حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص جارہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آکر دبالیا۔ جب اس نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک جانی دشمن ہے تو اس وقت اس کی حالت جو کچھ ہوگی وہ اظہر من الشمس ہے (۱)۔ یہی کوشش کرے گا کہ کسی صورت سے جلدی چھوٹوں اور جس صورت سے بھی ہو میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں۔

ایک حالت یہ ہے کہ یہ چلا جارہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آکر دبالیا۔ اس نے پیٹھ پھیر کر جو دیکھا تو اس کا وہ محبوب تھا جس کی برسوں سے تلاش میں تھا اور مدت سے اس کی وجہ سے خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ اس کو دبائے ہوئے ہے۔ بتلائیے اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی کیا اس کا دبانا کچھ ناگوار ہوگا۔ ہرگز نہیں بلکہ اگر وہ محبوب اس سے یوں کہے کہ اگر تجھے میرا دبانا، ناگوار معلوم ہو تو میں اس تیرے رقیب کو اسی طرح سے دبالوں، تو ہرگز یہ شخص پسند نہ کرے گا۔ بلکہ یہی خواہش کرے گا کہ جتنا جی چاہے مجھے دبالے اور اپنی کمر کو اس سے ملادے گا۔ تو ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں واقعہ ایک ہی ہے یعنی دونوں جگہ وہ واقعہ بغل میں دبالینا ہی ہے۔ مگر دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات واقعہ موجب پریشانی اور حزن (۲) نہیں بلکہ عوارض موجب حزن (۳) ہوتے ہیں۔ اگر واقعات فی نفسہ موثر ہوتے تو اس واقعہ میں دونوں جگہ اثر یکساں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ فی نفسہ مؤثر نہیں بلکہ عارض مؤثر ہے۔ انتساب الی العدو کا اور اثر ہے اور انتساب الی الصدیق (۴) کا اور اثر ہے۔ یہی فرق ہے ان واقعات میں جو

---

(۱) اس وقت اس کا جو حال ہوگا وہ سورج سے بھی زیادہ ظاہر ہے (۲) پریشانی اور غم کا باعث نہیں (۳) بلکہ عوارض غم کا باعث ہوتے ہیں (۴) جب وہی کام دشمن کرے تو اور اثر ہے جب دوست کرے اور اثر ہے۔

اہل اللہ اور اہل دنیا دونوں کو پیش آتے ہیں کیونکہ ذات واقعہ تو پریشانی اور حزن میں موثر ہے۔

اہل دنیا کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو تنگ اور بدحواس ہوتے ہیں اور اہل اللہ کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ان کے لئے موجب فرحت ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کلفت دہ چیز سے ان کو طبعی تکلیف بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس تکلیف میں بھی ان کو فرحت عقلیہ ہوتی ہے۔

اہل اللہ کا حال

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کے پھوڑا نکل رہا ہو۔ جراح یا ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھ کر نشتر لگانا تجویز کیا مگر ڈاکٹر کے پاس بیہوش کرنے کی دوا (کلورافارم) اس وقت موجود نہ تھی۔ اس نے ہوش ہی میں نشتر لگا دیا۔ نشتر لگتے ہی تکلیف کی وجہ سے ایک آہ نکلی مگر جب مواد نکل چکا اس وقت ہنس رہے ہیں اور ڈاکٹر کو انعام میں پچاس روپیہ دیئے جا رہے ہیں مگر ڈاکٹر اس کو کم سمجھ کر واپس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ انعام لوں گا اور یہ خوش ہو رہے ہیں۔ گو نشتر لگتے ہی طبعاً تکلیف بھی ہوئی اور آہ بھی نکلی مگر باوجود اس کے بعد میں خوش ہو رہے ہیں اور انعام دیا جا رہا ہے اور مانگا جا رہا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ گو رنج طبعی ہوا مگر فرحت عقلی کی وجہ سے وہ رنج رنج نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح سے جو لوگ اہل اللہ ہیں ان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے خواہ کتنا ہی موجب حزن و پریشانی ہو(۱) مگر ناگواری جس کا نام ہے وہ ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ گو کسی واقعہ کلفت دہ سے طبعی تکلیف ہو مگر ناگواری کا نام نہیں ہوتا بلکہ فرحت عقلیہ ہوتی ہے انتساب الی الحق کی وجہ سے (۲) کیونکہ ذاتِ واقعہ تو موثر نہیں بلکہ انتساب موثر ہے۔ تو انتساب الی الحق کی

(۱) غم و پریشانی کا باعث ہو (۲) اللہ کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر۔

وجہ سے ان کو فرحت ہوتی ہے اور اس وقت وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

’’زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور مار ڈالیں میں آپ پر فدا ہوں میں دل وجان سے آپ کا عاشق ہوں آپ کی مرضی جو چاہے کریں‘‘

غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ احکام شرعیہ تنگی کے واسطے موضوع نہیں اور احکام شرعیہ میں فی نفسہٖ آسانی ہے محض آثار سے تنگی ہوتی ہے اور وہ آثار اسی شخص کے حالات ہوتے ہیں جن کو یہ درست کرسکتا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے۔ یہ تنگی اسی وقت تک ہے کہ صرف علم الیقین کا درجہ ہو جو شرط ایمان ہے۔ اور عین الیقین میسر نہ ہوا ہو۔ جب عین الیقین کا مرتبہ میسر ہوگا۔ (یہی معنی ہیں ان آثار کے درست کرنے کے) اس وقت آپ کو بھی ہر حکم میں سہولت معلوم ہوگی۔ اور یہ درجہ کوئی سلف صالحین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اب بھی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ یہ مقام ولایت کا ایک درجہ ہے اور نبوت تو بے شک ختم ہوگئی مگر ولایت ختم نہیں ہوئی۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست خم و خمخانہ بامہر و نشان است

’’اب بھی رحمت کا بادل درخشاں ہے خم وخمخانہ مع مہر ونشاں کے موجود ہے‘‘

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے جب طاعت کروگے اسی وقت اثر معلوم ہوگا کہ کس قدر اور کس درجہ عمل میں سہولت ہے اور کس قدر عمل سے فرحت ہوتی ہے۔

احکام شریعت کی تنگی کی مثال

غرض احکام شریعت میں یہ خیال کر لینا کہ ان میں تنگی ہے محض خیال خام ہے۔ شریعت میں اصلاً تنگی نہیں۔ شریعت کی تنگی تو ایسی تنگی ہے جیسے ایک حکیم نے ایک مریض کے واسطے بہت سی چیزیں بتلادیں کہ یہ مضر ہے اور یہ مفید ہے اس پر

کوئی یہ کہے کہ ان حکیم صاحب کے مزاج میں تنگی ہے۔ان سے تو فلانے حکیم بڑے اچھے ہیں کہ وہ کسی چیز کو بھی منع نہیں کرتے۔اصل یہ ہے کہ وہ محض نام ہی کا حکیم ہے جو کسی چیز سے نہیں روکتا اور وہ خیم شفقت ہے جو مضرات سے روکتا ہے اور اس وقت ہر شخص یہ کہے گا کہ طبیب کا مقصود تنگی نہیں بلکہ مقصود شفقت ہے۔اسی طرح احکام شرعیہ کا مقصود تنگی نہیں بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی مقتضی ہوئی ہے ہر امر سے تعرض کرنے کی اور احکام بتلانے کی۔تو احکام کا اصل منشاء رحمت ہے تنگی نہیں ہے اس لئے ہر چیز کا قانون اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔البتہ احکام میں درجات ہیں سب میں اہم تو عقائد ہیں۔اس کے بعد مرتبہ شعائر دین کا ہے جیسے نماز روزہ اس کے بعد بقیہ احکام مجھ کو اس وقت عقائد یا نماز روزہ کے متعلق بیان کی چنداں ضرورت نہیں گو وہ سب سے زیادہ ضروری ہیں مگر اس کی ضرورت اور جزو دین ہونا سب کو معلوم ہے بلکہ ایسے حکم کے بیان کی حاجت ہے جو واقع میں جزو دین ہے مگر لوگ اس کو جزو دین نہیں خیال کرتے۔ایسے مضمون کے بیان کی سخت ضرورت ہے اور میں نے ایسا ہی مضمون اختیار کیا ہے۔مگر یہ مضمون اس بنیاد کی بابت نہ سمجھا جاوے جو کل رکھی گئی ہے، جو بوجہ عموم کے اس کو بھی مشتمل ضرور ہے اور نہ مجھ کو اس بنیاد کی بابت زیادہ مضمون بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی زور دینے اور نہ ترغیبی مضمون بیان کرنے کی حاجت ہے وہ کام خود اپنی ضرورت ظاہر کردے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

''مشک وہ ہے جو خود خوشبو دے نہ کہ عطار بولے''

مدارس پر اعتراض کی حقیقت

ہاں کوئی اس کام کو کام ہی نہ سمجھے تو دوسری بات ہے اس وقت استطراداً

بنیاد مدرسہ پر ایک مضمون ذہن میں آگیا وہ یہ کہ بعض لوگ دینی مدارس و مساجد پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ان میں انتظامی اور صفائی نہیں نہ بوریئے درست ہیں نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے اگر ہم کبھی جائیں بھی تو کہاں بیٹھیں مگر میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ آپ یہ اعتراض کس پر کررہے ہیں؟ صاحب! مدرسہ کسی مہتمم یا متولی کا گھر نہیں سب مسلمانوں کا مشترک مدرسہ ہے اگر وہاں کی بے انتظامی اور عدم صفائی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اپنے مدرسہ کی صفائی اور نظافت کا آپ خود کیوں نہیں خیال کرتے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ہے اور واقع میں وہ خود اپنی حالت ہے اور وہ اعتراض اپنے اوپر پڑتا ہے۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

''اے بے وقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا''

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بیوقوف کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اٹھا تو ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ باپ کو آواز دی کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے آکر دیکھا تو اسے اپنی صورت نظر پڑی۔ تو آپ کہتے ہیں کہ تف ہے تیرے اوپر بوڑھے ہوکر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ شرم نہیں آتی تف ہے تیری اوقات پر۔

تو جیسے وہ اپنے زعم میں دوسرے کو کہہ رہا تھا اور واقعہ میں اپنے ہی کو کہہ رہا تھا۔ یہی حال ہمارا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

''اے بے وقوف تو اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا''

مساجد کی عدم خبر گیری

میں ایک دفعہ شاہ جہانپور گیا ایک رئیس کے یہاں دعوت تھی۔ ہم لوگ

دعوت میں گئے مگر نماز عشاء کا وقت قریب تھا اس لئے میں نے کہا کہ پیشتر ہم نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاویں گے۔ چنانچہ ہم لوگ مسجد میں گئے مگر وہ میزبان صاحب تشریف نہ لائے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے مگر مسجد میں نہ آتے تھے۔ مسجد کی حالت بہت خراب تھی۔ افسوس ہے کہ اللہ میاں کے گھر کی ایسی بے قدری کی جاتی ہے کہ نہ اس کی صفائی کا اہتمام ہے نہ خبر گیری کی جاتی ہے۔ غرض اس مسجد میں کسی قسم کا بھی انتظام نہ تھا۔ مٹی کی ایک ڈبیا رکھی تھی اور روشن ہو رہی تھی۔ جس کے دھوئیں اور بو سے سخت کلفت ہوئی۔ مسجد سے واپسی کے بعد میں نے اس حالت پر افسوس کیا تو وہ رئیس شرما گئے۔

غنیمت ہے بعضے تو ایسے موقع پر شوخی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو اسی واسطے اپنے گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں کہ مسجد میں صفائی کا اہتمام نہیں۔ مگر میں ادب وتہذیب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جو گھر پر نماز پڑھتے ہیں اسی لئے تو وہاں صفائی نہیں۔ کیونکہ اب نماز پڑھنے والے صرف غرباء ہیں۔ وہ بیچارے اپنی ہمت کے موافق جو کچھ ان سے ہوسکتا ہے انتظام کرتے ہیں تو آپ کا مسجد والوں پر اعتراض کرنا درحقیقت اپنے اوپر اعتراض ہے کیونکہ مسجد سب مسلمانوں کی ہے صرف غریبوں کی نہیں ہے۔ آپ بھی تو مسجد والوں میں داخل ہیں۔ پھر آپ خود کیوں نہیں انتظام کرتے جب کوئی پردیسی مسجد کو اس حالت میں دیکھے گا وہ تو یہی کہے گا کہ یہاں کے مسلمان بہت ہی ناقدرے ہیں جو مسجد کو اس حال سے رکھتے ہیں جس میں آپ بھی داخل ہوں گے کم از کم ایک آدھ وقت کی نماز تو آپ مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ اور مسجد کی خبر گیری رکھئے۔ مسجد خود بتلا دے گی کہ میرے اندر فلاں فلاں کمی ہے۔ اسی طرح سے مجھے یہاں کچھ ضرورت ترغیبی مضامین بیان کرنے کی نہیں

ہے۔ مدرسہ خود بتلا دے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے اور اگر اس پر بھی اعانت نہ کریں تو حق تعالیٰ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ اگر میں اس پر ترغیبی مضمون بیان کرتا تو اس وقت تو سامعین جوش میں کچھ دے دیتے مگر بعد میں بعضے لوگ میری طرف نسبت کرتے کہ ہم نے اس کی وجہ سے دے دیا۔ لہذا مجھے احسان لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کا کام سب مسلمانوں کا ہے میں اپنے اوپر کیوں احسان لوں۔

حضرت تھانوی کی احتیاط

ابھی قریب کا واقعہ ہے کہ جلال آباد میں ایک شخص نے مدرسہ کے لئے کچھ رقم دی، مرض موت کی حالت میں، پھر اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے لئے فرائض کا مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا میں نے جواب تو لکھ دیا جس میں وصیت اور میراث دونوں حکموں کی تحقیق لکھ دی مگر دستخط نہیں کئے۔ بعض لوگوں نے دستخط پر اصرار کیا میں نے کہہ دیا کہ دستخط سے ورثاء مجبور ہو جائیں گے اور یوں کہیں گے کہ ہم نے فلاں شخص کے کہنے کی وجہ سے وصیت کو مان لیا ورنہ نہ مانتے۔ تو میں خواہ مخواہ کیوں احسان لوں۔ ضروری جواب میں نے لکھ دیا ہے اگر اس میں شبہ ہے کسی اور عالم سے فرائض نکلوالیں اور اپنا اطمینان کر کے جو کچھ کریں خود کریں میرے اوپر احسان رکھنے کی کیا ضروری ہے۔

سفارش کی خرابیاں

صاحبو! اسی واسطے تجربہ کاروں کی طبیعت آج کل سفارش سے رک گئی ہے۔ اس لئے کہ اولاً تو سفارش کا اس زمانہ میں کوئی اثر ہی نہیں اور اگر اثر بھی ہو تو بہت ذلت سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ساری عمر دوسرے کا اپنی گردن پر احسان رہتا

ہے کہ اس کی سفارش سے ہم نے ایسا کردیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جیسوں کا کوئی اثر بھی نہیں۔ مگر جہاں اثر نہیں ہوتا وہاں کے لئے کوئی سفارش بھی نہیں چاہتا۔ سفارش وہیں کراتے ہیں جہاں کچھ اثر ہو، سوایسی جگہ دوسرے کو تکلیف ہے اور جہاں اثر نہ ہو وہاں اپنی ذلت ہے۔

اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں ایجاب وسلب (۱) کا مقابلہ ہے اور یہ حصر عقلی ہے (۲) اصل یہ ہے کہ یہ حصر عقلی نہیں ہے بلکہ ان میں باہم تضاد ہے (۳)۔ ہاں ارتفاع (۴) دونوں کا ممکن ہے اس لئے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نہ ذلت ہو اور نہ کسی کو تکلیف ہو بلکہ سفارش کا اثر ہو محبت کی وجہ سے۔ تو جہاں یہ صورت ہو وہاں سفارش کا مضائقہ نہیں۔ مگر آج کل ایسا نادر ہے والنادر کالمعدوم۔ (۵)

الحاصل سفارش کی تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نہ تو محبت کا اثر ہو اور نہ وجاہت کا اس میں تو ذلت ہے۔ ایک یہ کہ وجاہت کا اثر ہو محبت کا نہ ہو اس میں مخاطب کو تکلیف ہے۔

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر نہ ہو محض محبت کا ہو۔ اس میں مضائقہ نہیں اس میں نہ سفارش کرنے والے کو ذلت نہ مخاطب کو تکلیف۔ بشرطیکہ محبت کافی ہو اور بے تکلفی بھی ہو۔ چونکہ تیسری قسم نادرالوجود ہے (۶) اس لئے میں نے سفارش کرنی چھوڑ دی۔ اسی طرح تحریک چندہ کی بھی یہی دو حالتیں ہیں یا تو محرک (۷)

(۱) واجب ہونے نہ ہونے کا تقابل ہے (۲) عقلاً حکم ان دو صورتوں میں محصور ہے (۳) ایک دوسرے کی ضد (۴) یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی نہ ہوں (۵) کسی چیز کا بہت کم ہونا نہ ہونے کے برابر ہے (۶) تیسری قسم کم پائی جاتی ہے (۷) اس بات پر ابھارنے والے کا اثر ہے۔

کا اثر ہے یا نہیں۔ اگر محرک کا اثر نہیں تو ذلت ہے اور اگر ہے تو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اثر وجاہت ہی کا عموماً ہوتا ہے اور اس اثر سے چندہ لینا حلال نہیں الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منہ ''کسی مسلمان آدمی کا مال بدوں اس کے طیب خاطر کے حلال نہیں'' حدیث ہے اور اس وجہ سے میں بھی تحریک نہیں کرتا اور اس میں زبان کا بند کرنا ہی بہتر خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کا کام ہے اس لئے زبان سے چنداں تحریک کرنے کی حاجت بھی نہیں۔ اس کی صورت خود ہی شفاعت کرے گی اور کرتی ہے۔ صرف خلوص کی ضرورت ہے کسی اثر ڈالنے اور پالیسی کی حاجت نہیں کام شروع کر دینا چاہئے۔

چنانچہ حضور ﷺ نے تبلیغ اسلام میں کوئی تدبیر نہیں کی کوئی کاوش نہیں کی۔ ہم لوگ اگر اس وقت موجود ہوتے تو ہم تو یہی مشورہ دیتے کہ پہلے ذی اثر لوگوں کو اپنا متفق کرنا چاہئے جب وہ متفق اور ہم خیال ہو جاویں گے تو اور لوگوں پر زیادہ اثر ہوگا مگر حضور ﷺ نے ہرگز ہرگز یہ تدبیر نہیں کی باثر لوگوں کو مدد کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ چند غرباء ہی اول حضور ﷺ کے ہم خیال ہوئے اور پھر آپ ﷺ نے کفار کے مقابلہ میں کتنی سخت بات کہی تھی کہ خدائے وحدہ لاشریک لہ پر ایمان لاؤ اور اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ دو۔ سو ایسی ناگوار بات پھر وہ بھی علی الاعلان۔ پھر اس میں ذی اثر لوگ ہم خیال بھی نہیں مگر پھر بھی آپ کو تبلیغ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ کسی تدبیر کا اہتمام ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ذی اثر لوگوں کو ہم خیال کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ حضور ﷺ کا تو سچا رنگ تھا جو خود لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا ہے (۱) اس کو کسی دوسرے اثر کی ضرورت نہ تھی۔

(۱) اپنی طرف کھینچتا تھا۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است

بآب ورنگ وخال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

’’محبوب کا جمال ہمارے عشق وعرفان ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ وروپ اور خط وخال کی حاجت نہیں ہے‘‘

حضور ﷺ کی تبلیغ اسلام

صاحبو! شعبدوں کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو واقعی تصرفات(۱) پر قادر نہ ہو اور جو واقعی تصرفات پر قادر ہوں انہیں شعبدوں کی کیا ضرورت ہے۔ حضور ﷺ کو یہ حکم ہوا تھا کہ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾(۲) اور یہ حکم ہوا تھا کہ ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾(۳) اور انجمن کرنے کا اور انجمن بنانے کا حکم آپ ﷺ کو نہیں ہوا۔ چنانچہ حضور ﷺ یہ حکم سنتے ہی پہاڑ پر تشریف لے گئے اور تمام آدمیوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک غنیم پڑا(۴) ہوا ہے اور وہ تم کو لوٹنا چاہتا ہے تو تم میرے قول کو کیا سمجھو گے۔ سب بولے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین دیکھا ہے اس لئے ہم ضرور آپ ﷺ کے قول پر یقین اور اعتماد کریں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ اس خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ورنہ سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہ سن کر سب لوگ بگڑ گئے اور گستاخیاں کرتے ہوئے واپس ہوئے اس کے بعد بھی اسلام میں ضعفاء ہی(۵) داخل ہوئے اور کسی ذی اثر کے متفق کرنے کی سعی نہیں کی گئی مگر جب حق واضح ہوگیا تو بے ساختہ ذی اثر لوگوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام ہونا پڑا اور سمجھ گئے کہ واقعی یہی طریق فلاح ہے۔

(۱) دل پھیرنے پر (۲) سورۂ حجر:۹۴ (۳) سورۂ شعراء:۲۱۴ (۴) دشمن (۵) کمزور لوگ۔

اسی طرح ہم کو بھی اول کام کرنا چاہئے اور کسی کے متفق بنانے کا وہم نہ کرنا چاہئے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ جب تک کسی ذی اثر کو کام میں داخل نہ کریں اس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری انجمن کو ترقی نہ ہوگی بس انجمن کی ترقی کا موجب بااثر لوگوں کو خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی اور پہلے سے ایک سیٹھ کو اثر ڈالنے کے واسطے پڑھا کر لائے تھے کہ جب میں تقریر کر چکوں تو کھڑے ہوکر کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں چنانچہ جلسہ میں ان صاحب نے تقریر کی جب تقریر کر چکے تو وہ مہاجن صاحب کھڑے ہوکر بولے میں بھی تارید کرتا ہوں۔ ان صاحب نے آہستہ سے کہا کہ تائید تو انہوں نے کہا کہ تردید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے تعلیم کی مہاجن صاحب بولے کہ میں تاکید کرتا ہوں۔ خیر وہ ساکت ہوگئے کہ تاہم تائید ہوگئی۔

غرض یہ حالت ہوگئی ہے یہ بھی سلیقہ نہیں رہا کہ تائید کا کون اہل ہے اور کون نااہل۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس شخص کا اثر ہوگا۔ پس جس شخص کو ذی اثر سمجھتے ہیں اسی کو تلاش کرتے ہیں۔

نااہل کو منتظم یا مہتمم بنانا

حدیث میں ہے (اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہ فانتظر الساعۃ) ’’جبکہ کام کو اسکے غیر اہل کے سپرد کرو تو قیامت کا انتظار کرو‘‘ آج کل یہی حالت ہے کہ نا قابل کے کام سپرد کر دیتے ہیں اور اہل کے اس واسطے سپرد نہیں کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں، ان کے کرتے پاجامے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بے قدری ہوگی۔

حکیم الامت کا حکیمانہ جواب

اس لباس پر نظر کرنے پر ایک واقعہ یاد آ گیا مجھے ایک مرتبہ مدعو ہو کر اپنے احباب کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد جمعہ میرا بیان تھا۔ کرنل عبدالمجید خان جن کی طرف سے وعظ کا اعلان تھا، ان سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا انہیں کا بیان ہوگا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ تو وہ صاحب بولے کہ ان کا لباس کیسا ہے جیسے پاخانہ میں سے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بعد وعظ کے کہنا۔ چنانچہ انہوں نے بیان سنا۔ بعد وعظ کے بولے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جیسے کپڑے ہیں ویسی لیاقت ہوگی مگر یہاں تو برعکس قصہ ہے (۱)

یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہوا تو دوسرے بیان میں میں نے کہا کہ صاحبو! بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولویوں کو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی کپڑے بنانے دشوار ہیں اس لئے کہ اگر جائز آمدنی سے روپیہ کمانا چاہیں تو کوئی مولوی تحشیہ کتب کا کر کے کھاتا ہے (۲) اور کوئی تدریس میں مشغول ہے جن میں کوئی دس کا ملازم ہے اور کوئی بیس کا (۳)۔ انتہائی معراج اور نہایت عزت ہوئی تو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس آمدنی میں تو قیمتی کپڑے بننا دشوار ہیں اور اس کے سوا دوسرے طریقہ اختیار کریں کہ وعظ کہتے اور وصل کرتے پھریں۔ سو وہ عقلاً ونقلاً دونوں طرح ناجائز ہے۔ بس اس حالت میں صرف ایک یہ طریقہ رہ گیا کہ آپ لوگ ایک جوڑا بنادیجئے اور جتنی قیمت کا چاہے بنوادیجئے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے گھر نہ لے جاویں گے بلکہ شملہ میں ہی رکھ جاویں گے اور جب یہاں آنا ہوا کرے گا تو اسے پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے اور اگر کسی دوسری جگہ بھی اس مذاق کے آدمی

(۱) معاملہ الٹا ہے (۲) کتابوں پر حاشیہ لکھ کر اس کی اجرت لیتا ہے (۳) کسی کی تنخواہ دس روپے ہے کسی کی بیس روپے۔

ملیں گے ہم ان سے بھی جوڑا بنوا کر رکھ لیں گے۔ اب میں منتظر ہوں کہ یہ معترض صاحب جنہوں نے محض خیر خواہی کی وجہ سے ہمارے لباس پر اعتراض کیا ہے کیسا قیمتی جوڑا بنا کر لاتے ہیں۔ ان معترض صاحب کو یہ سن کر بے حد غیرت آئی۔

بس آج کل لباس کو دیکھا جاتا ہے۔ جس کے کپڑے اچھے ہوئے اس کو لیڈر اور سیکرٹری بنالیا جنہیں کام کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ محض نکمے لوگ انجمن کے منتظم ہیں۔ ایسے مواقع میں کام کے آدمی رکھے نہیں جاتے۔ چنانچہ آج کل ایسے منتظمین بہت ہیں اور وہ جو جی میں آتا ہے کرنے لگتے ہیں۔ یہ حالت ہے آج کل کے کام کرنے والوں کی اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے (اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ) ''جبکہ کام کو اس کے غیر اہل کے سپرد کرو تو قیامت کا انتظار کرو'' صاحبو! حضور ﷺ نے تو ضعفاء کو پہلے متوجہ کیا تھا اور ہم ذی اثر لوگوں کو پہلے لیتے ہیں۔ حالانکہ حضور ﷺ کے انتخاب سے ضعفاء کا مرتبہ پہلے ہے اقویاء کا پیچھے (۱)۔ ضعفاء میں باطنی قوت، ہمت، برکت خلوص زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اقویاء کے۔

بے ریاء ہدیہ

چنانچہ مجھے ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایک گاؤں ہے کیرانہ کے راستہ میں وہاں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے اڑھائی آنے دیئے میں نے فوراً لے لئے اور دعا دی اس لئے کہ اڑھائی آنے کے پیسے میں اگر کوئی زبردستی بھی ریا کی نیت کرے تب بھی قادر نہیں۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے اگر کوئی سو پچاس دیتا ہے تو طبیعت رکتی ہے کیونکہ احتمال ریا وغیرہ کا ہوتا ہے اور اڑھائی آنے کے پیسہ

(۱) غریب وکمزور لوگوں کا مرتبہ امراء اور قوی لوگوں سے بڑھا ہوا ہے۔

میں کسی چیز کا بھی احتمال نہیں۔ بہرحال غرباء اور ضعفاء ہی کے پیسہ میں خاص برکت ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم (۱) ''ضعفاء ہی کی بدولت تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے'' معلوم ہوا کہ نصرت علی الاعداء بھی ضعفاء ہی کی وجہ سے ہے۔ تو بیرونی برکت اور اندرونی برکت دونوں ضعفاء ہی کی وجہ سے ہیں۔ نصرت سے مراد بیرونی برکت ہے اور رزق سے مراد اندرونی برکت ہے۔ یہ سب غرباء کی بدولت ہے گو یہ ظاہری سائنس کے خلاف ہے کیونکہ ضعفاء میں کوئی ظاہری اثر نہیں ہوتا مگر مشاہدہ یہی ہے۔

غرض آج کل ظاہری وجاہت پر نظر کر کے ہر کام نااہل کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور ہر کام میں نااہل گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو بجائے کام کے روپیہ جمع کرنے کو بڑا مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود کام ہے خواہ کسی پیمانہ پر ہو۔ پس جس پیمانہ پر کام کرنا قدرت میں ہو اس کے موافق شروع کر دینا چاہئے۔

کام کی برکت

حق تعالیٰ نے کام میں یہ برکت رکھی ہے چنانچہ چند ضعفاء نے اسلام کا کام شروع کر دیا تھا تو مشرق سے مغرب تک آواز گونج گئی۔ چنانچہ انجیل کی ایک مثال ضعفاء اہل حق کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن میں نقل فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۲) ''(کہ جیسے دانہ زمین میں ڈالا گیا تو) جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ کھیتی موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تا کہ ان سے کافروں کو جلا دے''

(۱) کتاب التمہید لابن عبدالبر: ۱۰/۲۳۱ (۲) سورۃ الفتح: ۲۹۔

یہ برکت ہے کام کی کہ اگر رائی کا بھی دانہ ڈالو تو کھیت میں کس قدر بڑا درخت ہو جاتا ہے جب کام شروع کرنے میں اس قدر برکت ہے تو مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے۔

چندہ مدرسہ کے لئے حضرت تھانوی m کا معمول

میں کانپور میں تھا جب کام شروع کیا اور مدرسہ جامع العلوم کی ابتداء ہوئی تو صرف پانچ روپیہ ہاتھ میں تھے۔ مدرسہ خدا کے نام پر شروع کردیا پھر بحمدللہ مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ کانپور میں باوجود بکثرت مدرسے تھے مگر اس کے سامنے سب ماند پڑ گئے۔ لوگ دوسرے مدارس کے چندہ کی تحریک کرتے مگر سننے والے انہیں تو دیتے نہیں تھے اور جامع العلوم میں دیتے تھے شہر کے لوگ کسی جگہ کے متولی کا اعتبار نہ کرتے تھے اگر کوئی مسلمان ہوتا تو اس کے اسلام کا اعتبار نہ کرتے جب تک جامع العلوم میں آ کر مسلمان نہ ہوتا۔ ان سب امور کی وجہ صرف نیت خالص تھی کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ کسی سے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہمارے مدرسہ میں چندہ دو اور اگر از خود دینا چاہا اور قرائن سے معلوم ہوگیا کہ یہ دوسرے میں دیا کرتا ہے اور وہاں کا چندہ یہاں منتقل کرتا ہے تو لینے سے انکار کردیا جاتا تھا کیونکہ یہ نیت کرلی تھی کہ جب نہیں چلے گا چھوڑ دیں گے اس لئے کہ غایت تو حق تعالیٰ کی خوشنودی تھی اپنی ذات کے واسطے نہیں کیا تھا بس جب تک انہوں نے چاہا کام لیا اگر وہ نہ چاہتے تو ہم کو چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاتے۔

صاحبو! مدارس اور مساجد کی غایت یہی ہونی چاہیے اور اگر اس کے خلاف ذہن میں ایک مقدار معین کرلیتے کہ مدرسہ اس قدر اونچا ہونا چاہئے ایسے انداز کا ہو تو جب اس انداز کا حلال آمدنی سے نہ بنتا تو حرام سے بنانے کی سعی

کرتے (۱) اس کا انجام سوائے بربادی کے کچھ نہ ہوتا۔ مگر چونکہ رضامندی خدا تعالیٰ غایت تھی اس لئے کسی قسم کی سعی نہیں کی گئی خدا نے اس میں برکت کردی۔ واللہ خدا کے واسطے کام کر کے تو دیکھو۔ ان شاء اللہ خوب خوب ترقی ہوگی۔

تعمیر مسجد میں ایک بزرگ کا کردار

پیلی بھیت (۲) میں ایک بزرگ تھے اور وہ اصطلاحی عالم بھی نہ تھے۔ کنگھی بنایا کرتے تھے ایک دفعہ شاہ صاحب نے اسٹیشن پر مسجد بنانا شروع کی۔ ہندوؤں نے بھی مندر بنانے کی درخواست دے دی۔ کلکٹر نے بخوف فساد مسجد کی تعمیر کو بھی روک دیا۔ شاہ صاحب کو خبر کی گئی فرمایا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے اور تعمیر بند کردی لوگوں نے کہا کہ حضور اس میں کوشش کی اجازت دیجئے ضرور کامیابی ہوگی فرمایا ہم کو اس کی ضرورت نہیں ہم مسجد کس کے واسطے بناتے تھے۔ ہم تو خدا کے لئے بناتے تھے لوگ نہیں بننے دیتے بس نہیں بناتے ہم اپنا گھر کب بناتے تھے کلکٹر کو جو کہ مسلمان تھے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ کلکٹر خود شاہ صاحب کے مکان پر آئے اور ایسی صورت سے کہ لوگ نہ پہچانیں شاہ صاحب دروازہ میں بیٹھا کرتے تھے وہاں ایک تخت آنے والوں کے لئے پڑا ہوا تھا اور ایک چارپائی پر شاہ صاحب تشریف فرماتے تھے۔ کلکٹر پہنچے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے بیٹھ کر کہا سنا ہے کہ آپ کوئی مسجد بنانا چاہتے تھے اس کا کیا واقعہ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی ایک مسجد بنانا چاہتے تھے مگر کلکٹر نے روک دیا۔ ہم نے کہہ دیا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے ہمیں تو ثواب مقصود تھا اور وہ نیت سے مل گیا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا مسجد بھی بن جاتی۔ اب ان کو منظور نہیں ہے تو ہم بھی

(۱) کوشش (۲) جگہ کا نام۔

اصرار نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے جب کلکٹر سے یہ بیان کیا تو وہ اس سادگی سے متاثر ہوا اور کہا کہ وہ کلکٹر میں ہی ہوں۔ چلئے آپ مسجد کی تعمیر جاری کر دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا خدا تمہارا بھلا کرے۔

اس پر کچھ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ مسجد کوئی کسی کے باوا کا گھر تھا جو کسی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ ارے خدا کا گھر ہے جو بنوادے گا اسے خود ثواب ملے گا۔ ہم پر کیا احسان ہوا۔ مگر آج کل یہ بھی ایک طریقہ نکلا ہے کہ جب کوئی مدرسہ میں چندہ دیتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں نہ معلوم یہ کس چیز کا شکریہ ہے۔

میں نے ایک جلسہ میں کہہ دیا تھا کہ ہم کسی چندہ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کریں گے بلکہ دینے والوں کو الٹا ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ہم مصیبت جھیل (۱) کر ان کی رقم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کو موقع خیر میں صرف کرتے ہیں۔ اور جو لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے شاہ صاحب کی اس سادگی اور خلوص کی کس قدر برکت ہوئی اور کس قدر اثر ہوا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

''خودرو پودے زیور سے آراستہ ہیں ہمارے محبوب میں خدادا حسن ہے''

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

''پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے''

سادگی اور جاذبیت

غرض سادگی تو خود جاذب ہوتی ہے (۲) مگر ہم پر تکلفات لدے ہوئے ہیں اس لئے اس جذبہ کا احساس نہیں ہے واللہ اگر علماء اس سادگی کو اختیار کریں اور

(۱) مصیبت برداشت کر کے (۲) سادگی خود کھینچتی ہے۔

یہ تصنع اور بناوٹ چھوڑ دیں تو اہل دنیا ان کے دروازہ پر خود ہی آ کر ماتھا رگڑنے لگیں۔ پچھلے دنوں دیوبند میں کچھ مخالفت تھی کچھ آدمی شہر کے مدرسہ کا ممبر ہونا چاہتے تھے اور مدرسہ والوں کی طرف سے انکار تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی m سرپرست تھے میں نے مولانا کی خدمت میں گنگوہ خط لکھا کہ اگر یہ لوگ ممبر بنادیئے جاویں تو کسی سے اندیشہ تو کچھ ہے نہیں کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ فیصلہ تو کثرت رائے پر ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ کے لوگ کثیر ہیں۔ اس وقت مصلحت اسی کو مقتضی ہے کہ ان لوگوں کو ممبر بنادیا جاوے ورنہ یہ لوگ مخالف رہیں گے جس میں مدرسہ کی قوی مضرت کا اندیشہ ہے(۱)۔

مگر ان حضرات کی عقل تو قدسی ہوتی ہے(۲) وہ دوسری ہی عقل ہے کہ اس کے برابر کسی عقل کا ہونا مشکل ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اگر ہم ان کو مدرسہ میں داخل نہ کریں گے تو غایت مافی الباب(۳) وہ لوگ مخالفت کریں گے۔ اور ان کی مخالفت مدرسہ کو مضر ہوگی(۴)۔ اور مدرسہ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے ٹوٹ جاوے ہم تو نہیں توڑتے، جو ہم سے سوال ہو اور اگر ہم نے ان کو داخل کرلیا تو آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ تم نے نااہل کو کیوں داخل کیا اور تحریر فرمایا کہ ہم کو حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہے، مدرسہ مقصود نہیں۔ اللہ اکبر! کس قدر قوت کی بات ہے۔ پھر حضرت نے اہل شہر کی ممبری کو منظور ہی نہ کیا۔ آخر دو چار دن چلّا کر(۵) سب خود ہی بیٹھ رہے اور بعد کو سب سیدھے ہوگئے۔ یہ کاہے کا اثر تھا صرف اس کا کہ حضرت کو رضائے حق(۶) مطلوب تھی، بقاء مدرسہ مقصود بالذات نہ تھی(۷) جس کا یہ مذاق ہوگا وہ اہل دنیا کی ہرگز خوشامد نہ کرے گا

---

(۱) مدرسہ کے بڑے نقصان کا خدشہ ہے (۲) ان کی عقل تو پاکیزہ ہوتی ہے (۳) زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ مخالفت کریں گے (۴) مدرسہ کے لئے نقصان دہ ہوگی (۵) شور مچا کر (۶) اللہ کی خوشنودی (۷) مدرسہ کا بقاء اپنی ذات میں بغیر رضائے الٰہی مقصود نہیں تھا۔

اہل مدارس کو یہی طرز اختیار کرنا چاہیئے پس یاد رکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے۔ علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہے جس میں ان کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغناء(۱) میں ہے۔ علماء دنیاداروں سے جب تک استغناء نہ کریں گے اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی۔ اور جب علماء استغناء کرینگے اسی وقت عزت اور عظمت رونما ہوگی اور یہ دنیادار خود ان کے دروازوں پر ماتھا رگڑتے پھریں گے(۲)۔

خودداری کا تقاضا

مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر خود کھودی ہے کہ دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں چنانچہ دیوبند کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک تحصیلدار صاحب تھے ایک طالب علم کا کھانا ان کے ہاں مقرر تھا وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہوجایا کرتی تھی تو ان کا خالی وقت بیکار جاتا تھا۔ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے ایک دن دلسوزی(۳) سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلتا پھرتا ہے اگر آپ فرمائیں تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا آپ نے پڑھ کر کیا کیا۔ میرے دروازہ پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جاوے گا۔ یہ ہے آج علم دین کی قدر۔ علماء کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے دروازوں پر پیشاب بھی نہ کریں مگر صرف احتیاج کی وجہ سے ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے عذر کرتے ہیں کہ:

آنکہ شیران را کند رو باہ مزاج احتیاج است احتیاج است احتیاج

”جو چیز شیروں کو لومڑی بنا دیتی ہے وہ احتیاج تو ہے“

---

(۱) بے نیازی (۲) خود ان کے در پر آپڑیں گے (۳) دردمندی۔

مگر دوسرا شعر اس کا جواب بھی ہے کہ:

شیر نر کے میشود روباہ مزاج میزند برکفش خود صد احتیاج

شیر نر کب لومڑی مزاج ہوتا ہے وہ سو احتیاجوں کو اپنی جوتی پر مارتا ہے“

اہل مدارس کو نصیحت

انبیاء علیہم السلام کی تو یہ شان اور حالت تھی کہ جب وعظ و پند(۱) فرماتے تو صاف فرماتے ہیں۔ یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اور وَیٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا کہ ہم تم سے اجر اور مال نہیں مانگتے یہی تمہاری بھی حالت ہونی چاہیئے اگر یہ کہا جاوے کہ اگر نہ مانگیں تو کام کس طرح چلے گا۔ تو صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ کام خود ہی چلے گا۔ میں تو اکثر وعظ میں یہی کہہ دیتا ہوں کہ آپ مانگنا چھوڑ کر دیکھئے کہ اہل دنیا خود ماتھا رگڑیں گے(۲) اور آپ کو دیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی خود یہ حالت ہوگئی کہ ایک جگہ ایک مدرسہ تھا اس کے جلسہ میں ایک واعظ صاحب فرمارہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی(۳) ناچتی تو اس کو لوگ کس قدر دیتے ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا۔ افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی تو نہ آئی مجھے تو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکلے۔

حضرت تھانوی کی خودداری

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک وفد میں نواب صاحب کی خواہش پر میرا ڈھاکہ جانے کا قصد ہوا اور راہ میں کلکتہ بھی ٹھہرنا ہوا وہاں نواب صاحب کے ایک دوست ہم لوگوں کو لینے آئے ہوئے تھے وہ مل کر کہنے لگے ہمیں آپ کے تشریف

(۱) وعظ و نصیحت (۲) خود چل کر تمہارے پاس آئیں گے (۳) رنڈی۔

لانے سے بہت مسرت ہوئی کیونکہ آنے کی اس لئے امید نہ رہی تھی کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ کچھ دیا نہ جائے۔ میں نے کہا یہ شرط کون سی دشوار تھی کہنے لگے ایسا کب ہوسکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کو تو جی چاہتا ہی ہے میں نے کہا کیا محبوب کی خدمت اسی میں منحصر ہے (۱) کہ محبوب ہی محبّ کے گھر جاوے محبّ (۲) بھی تو محبوب کے گھر جا کر خدمت کرسکتا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ معاف کیجئے پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ بدتمیزی تو دیکھئے۔ مجھ کو بے حد غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صاحب آپ کا تو یہ خیال ہے کہ ہم پیاسے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ آپ ہی پیاسے ہیں۔ مگر ہمارے پاس تو دلیل ہے آپ کے پاس دلیل نہیں وہ دلیل سنئے کہ ہمارے پاس دین ہے اور اس کی آپ کو ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور آپ کے پاس دنیا ہے اور وہ بحمداللہ ہمارے پاس بقدر ضرورت موجود ہے اب آپ خود فیصلہ فرماویں کہ پیاسا کون ہے وہ صاحب یہ سن کر معافی کے خواستگار ہوئے اور پشیمان ہوئے۔ (۳)

میں نے قولاً تو اپنے مجمع کا استغناء (۴) اس طور سے ظاہر کیا اور عملاً اس طرح ظاہر کیا کہ میں پھر ڈھاکہ نہیں گیا کلکتہ ہی سے واپس ہوگیا اور مکان چلا آیا۔ اس پر بعض نو تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ ہم کو تمہارے ڈھاکہ جانے کا بہت افسوس تھا اور اب یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ کلکتہ ہی سے واپس چلے آئے۔

علماء اور ترقی

صاحبو! آپ لوگ جو ہمیں رائے دیتے ہیں کہ ترقی کرنی چاہیے تو ہمارے اندر اولا تو وسائل بھی ترقی کے نہیں اور وسائل اختیار کریں مثلاً حکام سے

(۱) کیا محبوب کی خدمت کا صرف یہی طریقہ ہے (۲) محبت کرنے والے (۳) شرمندہ (۴) گفتگو میں تو اپنی جماعت کی بے نیازی اس طرح ظاہر کی۔

ملیں نوابوں کے یہاں وفد بنا کر لے جائیں تو بعد میں پھر آپ ہی اعتراض کریں گے کہ مولویوں کو ایسا مناسب نہیں۔ چنانچہ میرا ڈھا کہ جانا بظاہر مذاق اہل ترقی کے موافق تھا۔ مگر دیکھئے انہیں لوگوں نے بعد میں اس کا نامناسب ہونا ظاہر کیا اور واپسی پر مسرت کا اظہار کیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس قسم کے وسیلے اختیار کرتا ہے کہ حکام سے ملاقات وغیرہ کرے تاکہ مسلمانوں کو نفع پہنچے اور اس میں مشغول ہو کر اسے شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل جائے تو یہی ترقی کی رائے دینے والے بعد میں اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو مخبر ہیں اور چناں ہیں اور چنیں ہیں (۱) میں ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جن کو شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل گیا ہے اور نہ مجھے حمایت کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو ان پر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ آپ کی تو رائے کے موافق انہوں نے عمل کیا۔ مگر افسوس اہل دنیا کی رائے پر عمل کر کے بھی وہ نیک نام نہ ہوئے بلکہ بدنام ہو گئے۔ اگر ہم اس قسم کے وسائل اور ذرائع کو اختیار نہ کرتے تو بے اعتبار نہ ہوتے اس وقت ترقی کا صرف ایک اعتراض ہوتا کہ مولوی ترقی نہیں کرتے۔ مگر وہ حالت عدم ترقی کی اس ترقی کی حالت سے ہزار درجہ افضل تھی۔

شان علماء

بس مولویوں کو اس طرح رہنا چاہئے:

نہ براشتر برسوارم نہ چوں اشتر زیر بارم　　نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

’’نہ میں اونٹ پر سوار ہوں اور نہ مثل اونٹ کے زیر بار ہوں نہ رعیت کا مالک ہوں نہ بادشاہ کا غلام ہوں‘‘

یعنی ان حضرات کو صرف تبلیغ عام یا خاص سے تعلق رکھنا چاہیے مال سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہئے۔ بلکہ اس باب میں نہایت آن بان (۲) سے رہنا چاہئے۔

(۱) یہ تو جاسوس ہیں ایسے ہیں ویسے ہیں (۲) شان وشوکت۔

حصول چندہ میں حضرت تھانوی m کی احتیاط

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہاں پانچ روپے بھیجے۔ اور یہ لکھا کہ طلباء سے دعا کرادینا۔ میں نے روپے واپس کردیئے۔ اور یہ لکھ دیا کہ یہاں دعا کی دوکان نہیں ہے اور دعا بکتی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ ایک شخص پانی پت کے قریب کے رہنے والے تھے اور مجھ سے بیعت تھے انہوں نے مدرسہ کیلئے پندرہ روپیہ مجھے دیئے۔ میں نے کہا کہ باوجود پانی پت میں مدرسہ ہونے کے جو آپ سے قریب ہے آپ یہاں کے مدرسہ میں کیوں دیتے ہیں۔ اس میں مجھے یہ شبہ ہے کہ تم یہاں اس نیت سے دیتے ہو کہ مدرسہ میں بھی یہ روپیہ صرف ہوگا۔ اور پیر صاحب بھی خوش ہوں گے۔ دونوں باتیں حاصل ہوجاویں گی اور میں نے یہ بھی کہا، دیکھو سچ بتانا اخفاء نہ کرنا(۱)۔ انہوں نے کہا جی ہاں مقصود تو یہی تھا میں نے کہا ایسے روپیہ کو پسند نہیں کرتا جس سے خوشنودی خدا تعالیٰ (۲) اور میری خوشی دونوں مقصود ہوں میں اسے شرک سمجھتا ہوں آپ نے تقرب خدا تعالیٰ (۳) میں مجھے بھی شریک کیا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا اور واپس لینے پر رضامند ہوگئے پھر صبح کو انہوں نے کہا کہ بے شک اس وقت تو میرا یہی مقصود تھا لیکن اب رات کو میں نے سوچا تو اب میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اسی مدرسہ میں دوں اور دوسری نیت سے توبہ کرلی۔ اس وقت وہ روپے میں نے لے لئے۔ میری اس غیرت سے اخروی فائدہ تو ظاہر تھا مگر ظاہری اور دنیاوی فائدہ بھی ہوا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے دوسو روپے میرے پاس مدرسہ کے لئے بھیجے اور اسی کے ساتھ وہاں بلانے کی تحریک بھی کی میں نے روپے واپس کردیئے اور ان کو لکھ دیا کہ اگر ان کے ساتھ میرے بلانے کی درخواست نہ ہوتی تو

(۱) اصل بات نہ چھپانا (۲) اللہ کی رضا (۳) اللہ کا قرب حاصل کرنے میں۔

میں قبول کرلیتا۔ اب تو یہ شبہ ہے کہ آپ مدرسہ میں یہ رقم دے کر گویا مجھ پر احسان رکھ کر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں سو مدرسہ میں رقم دینے کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ ان صاحب کا جواب آیا آپ روپیہ وصول کر لیجئے میں نہیں بلاتا۔ تو یہ سارا استغناء محض (۱) اس وجہ سے ہے کہ مجھے مدرسہ کا چلانا مقصود نہیں بلکہ محض رضائے حق مطلوب ہے اور یہ نیت کرلی ہے کہ اگر حدود کے اندر کام چلتا رہا چلاتے رہیں گے اور جس دن کچھ تجاوز کرنا پڑا یا تدبیریں سوچنا پڑیں کہ اب کیا انتظام کریں، کہاں سے رقم لائیں اسی دن مدرسہ بند کردوں گا۔ غرض یہ نیت رکھنی چاہیئے کہ جس روز مدرسہ نہ چلے گا نہ چلے ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے کوئی ہمارا ذاتی کام تو ہے نہیں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اس طرح مسلمانوں کی سبکی اور ذلت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علو شان کی حاجت ہی کیا ہے حضرت عمر h فرماتے ہیں نحن قوم اعزنا اللہ بالسلام (۲) تو ہماری علو شان کے لئے اسلام کافی ہے۔ ہمیں تو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔ اگر مسجد چونہ اور پتھر کی نہ بنے بلا سے نہ بنے۔ جعلت الارض لنا مسجد او طھورا (۳) تمام زمین مسجد ہے۔ یہ نیت کرلینا کہ اس قدر طول وطویل (۴) ہو اور ایسی ہیئت وشکل پر ہو فضول ہے ہر کام میں یہی نیت رکھئے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ خوشی سے شریک ہو فبہا (۵) ورنہ چھوڑ دیجئے یہ نیت رکھو کہ بالکل نہ رہے گا نہ سہی اور کم پیانہ پر ہوگا تو کم ہی سہی۔

خیرات مقصود

ایک ہندو کی حکایت ہے کہ وہ جے پور سے ہردوار (۶) کو چلا جس کے پاس گنی (۷) تھی۔ پھر کسی موق پر خیرات کرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوئی تو ایک دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک گنی (۸) کے روپے دے دو۔ اس نے کہا کہ پورے

(۱) یہ ساری بے نیازی صرف اس وجہ سے ہے (۲) ہم وہ قوم ہیں جس کی سربلندی اسلام کی بنا پر ہے (۳) ساری زمین ہمارے لئے مسجد وطہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنادی گئی (۴) لمبی چوڑی (۵) خوشی سے کوئی شریک ہو تو ٹھیک ہے (۶) جگہ کا نام ہے (۷) سونے کا سکہ (۸) اشرفی کے پیسے دیدو۔

پچیس روپے نہ دوں گا بلکہ بیس دوں گا یہ راضی ہوگیا تو اس نے اور کم کرنا شروع کیئے اور یہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دس تک نوبت آگئی اس نے کہا کہ لاتو دس ہی دے دے۔ تو وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم چرا کر لائے ہو جو اس طرح کم کرتے جاتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ میں اس وقت دان پُن (۱) کے واسطے چلا تھا۔ تو تو جس قدر کم دیتا میں اس میں پن کی نیت کر لیتا۔ اگر تو یہ بھی کہتا کہ میں کچھ بھی نہیں دیتا تب بھی میں راضی ہوجاتا اور تجھے گنی دے دیتا۔ تو صاحبو! حیرت ہے کہ ایک ہندو تو مقصود اصلی کو سمجھا اور مسلمان مقصود اصلی کو نہ سمجھے۔ جس طرح اس نے یہ سمجھ لیا کہ مقصود ثواب ہے خواہ گنی زیادہ میں جائے یا کم میں مجھے ثواب پورا ہی ملے گا۔ اسی طرح مسلمان کو سمجھنا چاہئے کہ کام خواہ اعلیٰ پیانہ پر چلے یا ادنیٰ پیانہ (۲) پر مقصود تو ثواب ہے اس کی فکر نہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ پیانہ پر ہی کام ہو۔

طاعت اور توفیق

صاحبو! اسلام نے غیرت کی بھی تعلیم دی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ انلزمکموھا وانتم لھا کارھون تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھیں اور تم اس سے نفرت کیئے چلے جاؤ اور فرماتے ہیں کہ لست علیھم بمصیطر (۳) آپ ان پر مسلط نہیں اور فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (۴) ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے

(۱) خیر خیرات کرنے کی نیت سے چلا تھا (۲) کام بڑے درجہ میں چلے یا چھوٹے درجہ میں (۳) سورۃ الغاشیۃ: ۲۲ (۴) سورۂ یونس: ۹۹۔۱۰۰۔

لوگ سب کے سب ایمان لے آتے۔ سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرتے ہیں جس میں وہ ایمان لے ہی آویں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدوں خدا کے حکم کے ممکن نہیں'' اور فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ﴾ (۱) ''اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے اور اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ نادانوں میں نہ ہو جائیے''۔ اور فرماتے ہیں: ﴿قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ﴾ (۲) ''اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے''

تو ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہئے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑے۔ اسی طرح مدرسہ والے بھی اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ بھی مدرسہ میں کچھ دے دے، وہ بھی کچھ امداد کر دے کسی کے پیچھے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب خدا کا حکم ہوتا ہے جب ہی کوئی دیتا ہے۔ زکوٰۃ و خیرات اور احسان جب کوئی دیتا ہے تو کسی پر کیا احسان۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی   منت شناس از وکہ بخدمت بداشت

''یہ احسان مت جتاؤ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں اس کا احسان مانو کہ

(۱) سورۂ انعام: ۳۵ (۲) سورۂ کہف: ۲۹۔

اس نے تم جیسے کو خدمت میں رکھ لیا ہے‘‘

خدا کا احسان ہے کہ وہ ہم کو اپنی طاعت کی توفیق دے دیں اور ہماری طاعت بدنیہ اور مالیہ (۱) کو قبول فرمالیں۔ اگر وہ قبول نہ فرماویں تو ہم کیا کر سکتے ہیں غرض جو کوئی مدرسہ کی امداد کرتا ہے خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ مہتمم مدرسہ پر کیا احسان ہے پھر وہ کیوں کسی کی خوشامد کرے اور کیوں کسی کا شکریہ ادا کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے استغناء ہی سے کام لیا ہے۔

زکوٰۃ نہ دینے کا وبال

چنانچہ ایک شخص منافق تھا۔ اس نے بکریاں پالیں اور حضور ﷺ سے دعاء برکت چاہی۔ آپ ﷺ نے دعا فرمادی۔ وہ بہت بڑھ گئیں۔ اس سے زکوٰۃ مانگی گئی تو اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی۔ پھر خود لایا تو حضور ﷺ نے بوجہ وحی کے نہ لی پھر حضرت ابوبکر h کے زمانہ میں زکوٰۃ دینا چاہی مگر حضور ﷺ کی متابعت میں زکوٰۃ (۲) نہ قبول کی گئی۔ پھر حضرت عمر h کے زمانہ میں دینی چاہی اس وقت بھی نہیں قبول کی گئی۔ حضرت عثمان h نے بھی نہیں لی۔ پھر وہ آپ کے زمانہ میں مرگیا۔ اس وحی خاص میں جس کی متابعت حضرات خلفاء نے بھی کی یہ بھی نکتہ تھا تاکہ ظاہر ہوجاوے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں کسی پر کچھ احسان نہیں صرف اپنا ہی نفع ہے اگر تم ایک بار انکار کروگے تو ہم دس بار واپس کردیں گے۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان نہیں بلکہ چندہ لینے والے کا احسان ہے کہ اس نے لے کر آپ کو پاک صاف کیا۔

(۱) ہماری جسمانی اور مالی عبادت (۲) حضور ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے۔

بقاء علم کی صورت

خاص کر جب کہ یہ ایسی جگہ ہے جو ایک زمانہ تک مرجع خلائق رہی ہے[1] تو اس کا حق ادا کرنا سب ہی کے ذمہ ہے نہ کہ ایک شخص پر تمام بار ڈال کر اس کا انتظام کیا جاوے۔ کیا وہ سب سے مانگے۔ اور وہ زمانہ مفتی الٰہی بخش صاحب کا تھا جو اپنے وقت کے آفتاب تھے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسی جگہ درس تدریس کا سلسلہ ضرور قائم و باقی رکھا جاوے۔ اس کی بقا کی صورت ہمارے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوئی ہے کہ مدرسہ کا ایک خاص مکان ہو جس میں کچھ جگہ درس تدریس کے لئے ہو اور کچھ جگہ طلباء کے رہنے کی ہو، اور کتب خانہ بھی ہو، اور وہ مکان وقف ہو، اور مدرسہ کی ملک ہو، اور اس میں طلبہ و مدرسین درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ اگر عقلاء اس کے سوا ہمیں اور کوئی صورت قیام علم کی بتلاویں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو سمجھا دی جاوے تو میں ضرور قبول کرلوں گا۔ اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ دو چار مدرسے جن میں میرا من وجہ اختیار ہے[2] ان کے ویران کرنے کی سب سے اول میں ہی کوشش کروں گا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ایسی صورت ہو کہ تجربہ سے اس کا صحیح اور درست ہونا معلوم ہوگیا ہو۔ تو اس وقت میں ان منتظم[3] مدرسوں کی مجذوب کی لنگوٹی کی طرح رخصت کردوں گا۔

حکایت

جیسے ایک مجذوب کا قصہ ہے یہ خدا کو معلوم ہے کہ واقع میں بھی مجذوب تھے یا نہیں۔ غرض وہ ننگے پھرا کرتے تھے ایک دفعہ مریدوں نے لنگوٹا باندھ دیا مگر چونکہ مجذوب تھے اس واسطے کھانا اس طرح کھاتے تھے کہ روغن[4] وغیرہ سب

(۱) لوگوں کا اس طرف رجوع رہا ہے (۲) کچھ تھوڑا بہت اختیار ہے (۳) ان ناظم مدرسہ کو (۴) گھی وغیرہ چکنی چیزیں۔

لنگوٹے پر گرتا تھا آخر وہ چکنا ہوگیا چوہوں نے اسے کترنا(۱) شروع کردیا۔ جب چوہے بکثرت ہوگئے تو ان کے لئے بلی پالی گئی تاکہ چوہوں کو کم کرے۔ بلی نے ہر چیز کھانی شروع کردی جو چیز کھانے کو رکھی گئی وہی کھا گئی۔ اس کے واسطے کتا پالا گیا۔ جب کتے نے ستانا شروع کیا تو اس کی حفاظت کے واسطے ایک نوکر رکھا گیا اور جب وہ ادھر ادھر نظر کرنے لگا تو اس کا نکاح کردیا گیا اور اقتران صغریٰ و کبریٰ(۲) سے نتیجہ پیدا ہوگیا۔ ایک دن مجذوب صاحب کو جو کچھ افاقہ ہوا تو ایک ہجوم دیکھ کر پوچھا یہ کیسا قصہ ہے میرے آس پاس یہ ہجوم کیسا ہے مریدوں نے سارا قصہ بیان کیا تو مجذوب صاحب نے لنگوٹی اتار کر پھینک دی کہ یہی بکھیڑے کی جڑ ہے(۳) ہم اسی کو نہیں باندھتے۔

ضرورت مدارس

تو ہم بھی اگر آپ کو بقائے علم کی اور کوئی تدبیر بتلائیں گے اور سمجھا سکیں گے تو ان مدرسوں کو لنگوٹا سمجھ کر پھینک دیں گے۔ مگر جب بقاء علم کی صورت اہل تجربہ کے تجربہ سے اسی صورت میں منحصر ہوگئی ہے تو اب اس کے ابقاء(۴) کی کوشش میں کیا عذر ہے اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ صرف مدرسہ ہی آپ کا محتاج نہیں بلکہ آپ بھی اس کے محتاج ہیں یعنی مدرسہ جیسے آپ کی اعانت کا محتاج ہے اسی طرح آپ مدرسہ کی برکت کے محتاج ہیں بلکہ مدرسہ تو مجازاً ہی محتاج ہے مگر آپ حقیقت میں محتاج ہیں جیسے فقیر سخاوت کا حقیقۃً محتاج ہے اور سخاوت کو فقیر کی مجازاً حاجت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

(۱) چوہوں نے کاٹنا شروع کردیا (۲) دونوں چھوٹے بڑے کے مل جانے سے بچے پیدا ہوئے اور آبادی بڑھ گئی (۳) سارا فساد اس لنگوٹی کا ہی ہے یہی نہیں پہنتا (۴) مدارس کو باقی رکھنے کی کوشش میں۔

بانگ می آید کہ اے طالب بیا جود محتاج گدایاں چوں گدا

''آواز آئی کہ اے طالب آ، سخاوت مثل گدا کے فقیروں کی محتاج ہے''

اور احتیاج سے مراد توقف ظہور ہے (۱) مجازاً احتیاج سے تعبیر کر دیا۔ اور عجیب بات ہے کہ باوجود یکہ ظاہراً مولانا پر جذب کا غلبہ کم ہے عارف شیرازی سے مگر اس مضمون کو حافظ شیرازی نے نہایت متین عنوان (۲) سے تعبیر کیا ہے اور مولانا کا عنوان ذرا موہم ہے (۳) اس لئے کہ مولانا نے احتیاج سے تعبیر کیا ہے برخلاف حافظ صاحب کے کہ انہوں نے شوق سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد ما بہ او محتاج بودیم اورا بما مشتاق بود

''معشوق کا سایہ عاشق پر پڑے گا تو کیا ہوا ہم اس کے محتاج اور وہ ہمارا مشتاق ہے''

تو حافظ کا اشتیاق سے تعبیر کرنا مولانا کی اس تعبیر سے سہل ہے گو حق تعالیٰ تو اشتیاق لغوی سے بھی جو کہ ایک قسم کا انفعال ہے منزہ ہیں (۴)۔ مگر اس کے سہل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اشتیاق حدیث میں وارد ہے (۵)۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے۔ قال جبریل علیه السلام ان الله قد اشتاق الی لقائك (۶) (كذا فی نشر الطيب) تو اشتیاق کا لفظ حدیث میں موجود ہے برخلاف لفظ احتیاج کے کہ وہ حدیث میں موجود نہیں ہے۔ یہ سب کلام مدارس دینیہ کی ضرورت کے متعلق تھا۔

مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ

اب مقصود آیت کی طرف عود کرتا ہوں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس

(۱) سخاوت کے ظاہر ہونے میں جو توقف ہو اس کو احتیاج سے تعبیر کیا (۲) سنجیدہ عنوان سے بیان کیا (۳) مولانا کے عنوان میں احتیاج کا وہم ہوتا ہے (۴) لغوی طور پر اشتیاق کے جو معنی ہیں اللہ پاک اس سے بھی پاک ہیں (۵) آیا ہے (۶) اللہ تعالیٰ آپ سے ملاقات کے مشتاق ہیں۔

وقت مدرسہ کی عمارت کی نسبت خصوصا اور جملہ عمارات کی بابت عموما بیان ہوگا۔
چنانچہ حق تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں۔﴿ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى ﴾ ’’ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہو‘‘ یہ آیت ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے اس سے علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کے حکام بیان کرنا ہیں اوراس پر پھر جملہ (۱)تعمیرات کو قیاس کرنا ہے۔غرض یہ آیت مسجد خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔ملخص قصہ (۲) کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلّہ ہے۔’’قبا‘‘ اس کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلّہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا کرتے کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد　　باخاک آسائش درایم مرحبائے

’’جس منزل میں محبوب کسی روز پہنچے ہوں ہم اس کی چوکھٹ کی خاک کو مرحبا کہتے ہیں‘‘

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ(۳) کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے، یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اوراس کا پریذیڈنٹ ابوعامر راہب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔اورابوعامر کا ہرقل شاہ روم سے میل جول تھا۔ابوعامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہرقل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔جس سے اسلام نیست و نابود ہو جائے گا۔
ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کرلیا

(۱) تمام تعمیرات کے حکم کو قیاس کرنا ہے (۲) قصہ کا خلاصہ (۳) جڑ اکھاڑنے کے درپے تھے۔

تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست ونابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ''ان اللہ معنا'' (۱) کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس ہے کہ آج کل یہی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کند ہورہی ہے کیونکہ مرضیات الٰہی سے (۲) مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہوجاتا ہے اگر مسلمان اس چھری کو تیز کرلیں یعنی خدا تعالیٰ کوراضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آجائے گا جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے مسجد کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورۃً مسجد کی شکل تھی غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرانا تھا جیسے بیع نامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضور ﷺ نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی، کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تاکہ وسعت و سہولت ہو گرمی سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے (۳)۔ اس سے گنجائش ہوگئی نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جاسکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے۔ حضور ﷺ نے بنا پر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کرلیا (۴) غرض حضور ﷺ نے وعدہ فرمالیا کہ تبوک سے آکر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ

---

(۱) بیشک خدا ہمارے ساتھ ہے (۲) اللہ کی پسندیدہ باتوں سے (۳) ایک مسجد میں سب جمع نہیں ہوسکتے
(۴) حضور ﷺ نے ان سے حسن ظن رکھتے ہوئے ان کی بات کی تصدیق کی اور وعدہ کرلیا۔

نے آپ ﷺ کو حقیقت حال کی اطلاع کردی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرمادیا اور یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (۱) ''اور بعضے ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں۔ اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھاجاویں گے کہ بجز بھلائی کہ ہماری اور کچھ نیت نہیں۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ ﷺ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی کہ یہ مسجد صرف صورۃً ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں کو ضرر (۲) پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے اور ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار کی گئی ہے اور یہ لوگ قسمیں کھاجاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہوجایئے اور نہ نماز پڑھئے۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھئے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس میں ایسے آدمی ہیں کہ

(۱) سورۂ توبہ: ۱۰۷، ۱۰۸ (۲) نقصان پہنچانے۔

خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔ غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے کی ممانعت ہوگئی چنانچہ حضور ﷺ نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے (۱) چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوادی اور منہدم کرادی (۲) اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار (۳) کے لئے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرز نصیحت

اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ﴾ (۴) ''کیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا اور خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گھاٹی کے کنارے پر رکھی ہو جو گرنے ہی کو ہو پھر اس کو ساتھ لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑے''

ہمزہ استفہام کا ہے اور فا تفریع کا ہے اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک کی تو بنا تقویٰ (۵) پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر، اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے؟ جب بناؤں (۶) کی حالت معلوم ہوگئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہوگئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور ''ہ'' کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور ''من اللہ'' تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ

(۱) پیدا ہوتے (۲) گروادی (۳) نقصان پہنچانے کے لئے بنائی گئی تھی (۴) سورۂ توبہ:۱۰۹ (۵) ایک کی بنیاد (۶) جب عمارتوں کی بنیاد کی غرض معلوم ہوگئی۔

تقویٰ من جانب اللہ ہے [۱] اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ [۲]۔ مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو؟ یہ طرز بلاغت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا [۳]۔ پس دونوں کے افعال بیان کر دیئے اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا موثر ہے اور اگر ناصح خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرانی ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی m کا اندازِ نصیحت

چنانچہ اس کی تائید میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مدرسہ میں جلسہ تھا ایک واعظ صاحب نے وعظ فرمایا اور وعظ میں یہ فرمایا کہ علی گڑھ کالج والے سودی ڈگریاں کرتے ہیں اس لئے ملعون ہیں۔ بات تو صحیح تھی مگر الفاظ سخت تھے اس لئے سامعین کو گراں گزرا اور ناگوار ہوا۔ سامعین بگڑ گئے جب لوگوں کی ناگواری کا مہتمم جلسہ کو احساس ہوا تو اس کا تدارک کرنے کے واسطے کھڑے ہوئے اور خود تقریر کی، خدا اور رسول ﷺ نے یہی کہا ہے جو واعظ صاحب نے فرمایا ہے۔ وہ غیر ڈ لک [۴] مگر مہتمم صاحب کی تقریر سے بھی اس کا کوئی تدارک نہ ہوا۔ تو مہتمم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ چونکہ مجھ کو اپنے کرم فرماؤں سے انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے اس لئے ہر ایسے موقع پر مجھے ہی سب پھنسانا چاہتے ہیں۔ اول تو میں نے کہا کہ تمہاری یہ سزا ہے۔ بات کہو مگر نرمی سے کہو سختی کی کیا ضرورت ہے، کرو تم اور بھگتوں میں، یہ اچھی رہی مگر وہ اصرار کرنے لگے تو میں کھڑا ہوا۔

(۱) تقویٰ اللہ کی طرف سے ہے (۲) اور پسندیدگی کو بھی من اللہ کی قید سے مقید کیا گیا (۳) کہ مخاطب خود فیصلہ کر لے کون بہتر ہے (۴) اسی قسم کی اور چند باتیں۔

میں نے کہا صاحبو! اعمال وافعال مباحہ میں نیت پر مدار ہے۔ تو اگر کوئی شخص سخت لفظ کہہ دے مگر نیت مذموم (۱) نہ ہو تو ناگوار نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ نیت تو مذموم نہیں ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ مولوی صاحب کی نیت کیا تھی ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے محض شفقت کی راہ سے کہا ہے جیسے کسی کا لڑکا زہر کھانے لگے اور وہ اس کو سختی کے ساتھ دھمکائے تو اس سے کسی کو ناگواری نہیں ہوتی کیونکہ جانتے ہیں کہ منشاء (۲) اس کا محض شفقت ہے اب بتلائیے کہ ہم لوگ جو برے افعال کرتے ہیں ان سے مولوی صاحب کا کیا نقصان ہے اور اگر ہم پارسا ہوجائیں تو اس سے مولوی صاحب کا کیا نفع ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ہم کو مضر باتوں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے تو یہ اس کی شفقت ہے یا نہیں۔ اس کو آپ کی حالت بگڑنے پر افسوس ہوتا ہے اس لئے غصہ اور تیزی کے ساتھ آپ کو روکنا چاہتا ہے۔ اگر شفقت نہ ہوتی تو اس کی جوتی کو غرض پڑی تھی جو کسی کی اصلاح کے درپے ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھ کو حیرت ہے کہ آپ لوگ تو فطرت کے بہت معتقد ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً مختلف المزاج (۳) پیدا ہوئے ہیں مزاجوں میں باہم بہت بڑا تفاوت ہے (۴) چنانچہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیزی سب کو معلوم ہے اور ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ایک ہمارے حضور سیدنا رسول اللہ ﷺ ہیں۔ تو آپ نے مولوی صاحب کی سختی کو فطرت کا تابع کیوں نہ تجویز کرلیا۔ پھر میں نے اسلامی احکام اور کالج والوں کا ان سے بعد (۵) بیان کرکے اخیر میں کہا کہ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسا شخص جو ان احکام کی

---

(۱) نیت بری نہ ہو (۲) اس کی وجہ (۳) شفقت و محبت ہے (۳) لوگوں کا مزاج پیدائشی طور پر مختلف ہے (۴) فرق (۵) اسلامی احکام سے کالج والوں کے دور ہونے کو بیان کرکے۔

پابندی نہ کرے مرحوم برحمت (۱) خاص ہوسکتا ہے یا رحمت خاص سے اس کو بعد ہوگا اور یہی معنی ہیں لغت کے۔ بس آپ ہی فیصلہ کردیجئے ہم کچھ نہیں کہتے تو میں نے دونوں قسم کے افعال بیان کرکے فیصلہ خود ان سے چاہا۔ جس سے سب سامعین خود معترف ہوگئے کہ ہم ہی خطاوار ہیں۔

اصلاح احوال کے طور طریقے

تو ایک طرز تو یہ ہے کہ ان کے اقوال وافعال اجنبیانہ طور (۲) پر بیان کردیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے۔ پھر خود ان سے ہی فیصلہ دریافت کرلیا جائے تو یہ طرز زیادہ موثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کرکے حکم لگادو کہ تم ملعون ہو۔ جیسے ان مولوی صاحب نے کیا تھا یہ طرز موثر نہیں ہوتا۔ تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون خیر پر ہے؟ یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے۔ اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو، رکھی ہو یعنی ڈھانگ (۳) پر رکھی ہو جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے (۴) تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی (۵) کو لے کر گرے گی جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا وہ بھی گر گیا یہ سب سے زیادہ ضرر ہے (۶) اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

---

(۱) کیا ایسے شخص پر خصوصی رحمت ہوسکتی ہے یا وہ اس سے دور ہوگا (۲) ان کے حالات کو بغیر کسی کا نام لئے عمومی عنوان سے بیان کردیا جائے (۳) دریا کے کنارے پر (۴) وہ کنارا گرنے ہی والا ہے (۵) بنانے والے کو لیکر گرے گی (۶) نقصان۔

تعمیری بنیاد

ایک نظیر (۱) یاد آگئی۔ میں بھرت پور گیا تھا خواجہ عزیز الحسن صاحب میرے ہمراہ تھے۔ چند وعظ بیان کرنے کا اتفاق ہوا جو خواجہ صاحب نے لکھے وہ سفر میں تھے ان کے ہمراہ ایک بیگ تھا جس میں وعظ بھی تھے۔ وہ بیگ ریل میں چوری چلا گیا خواجہ صاحب کو وعظوں کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہوا۔ میں نے ان کے رنج دفع کرنے کو کہا کہ میاں سر سلامت چاہئے ٹوپیاں بہت یعنی واعظ رہے تو وعظ بہت۔

اسی طرح اگر بانی (۲) رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں (۳) مکان بہت بن سکتے ہیں۔ اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔ اس بیٹھ جانے کے متعلق ایک بات یاد آگئی کہ آج کل یہ بھی مرض ہے کہ بہت اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں پھر جب وہ گرتی ہیں تو کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان آفات سے محفوظ تو گاؤں کے مکان ہیں جو نیچا ہونے کی وجہ سے زلزلہ میں بھی نہیں گرتا۔ ۲۸ اپریل منگل کے دن کانگڑے میں زلزلہ آیا۔ زلزلہ میں شدت تھی۔ ایک تو زلزلہ کی شدت دوسرے بڑے اور اونچے مکانوں میں حرکت تو میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمارے مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جو زلزلوں کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ ہے کہ مرکز سے محیل (۴) کو جس قدر بعد ہوگا اس میں حرکت زیادہ ہوگی دیوار جس قدر لمبی ہوگی زلزلہ میں حرکت زیادہ ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نیچے نیچے گھر والے دنیا میں بھی شدت زلزلہ سے محفوظ رہیں گے۔ اور خدا تعالیٰ کے یہاں بھی محفوظ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ مسئلہ بھی بتانا تھا کہ مکان ایسا بنانا چاہئے۔ جو مکین کو نہ لے بیٹھے اور کچے مکانوں اور نیچے گھروں میں گو بعض تکالیف ہوتی ہیں

(۱) مثال (۲) بنانے والا (۳) نقصان (۴) مرکز سے مقام جتنا دور ہوگا۔

مگر راحتیں زیادہ ہیں۔ اگر کبھی گر پڑا تو جلدی سے دوسرا ویسا ہی بن سکتا ہے۔

خدا گر بحکمت بہ بندد درے کشاید بہ فضل و کرم دیگرے

''اللہ تعالیٰ اگر حکمت سے ایک در بند کر دیتے ہیں تو اپنے فضل و کرم سے دوسرا دروازہ کھول دیتے ہیں''

اور یہاں اللہ تعالیٰ نے تاسیس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا بلکہ بنیاد مقید بقید خاص (۱) پر نکیر فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ خود مکان بنانا مذموم (۲) نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے (۳)۔

مکان کی اہمیت

ہاں بناء الفاسد علی الفاسد نہ ہو (۴)۔ وجہ یہ کہ بغیر مکان کے گزر نہیں اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب مکہ تشریف لے گئے تو فاقوں کو جھیل لیا (۵) مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ ایک روز مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی تشریف لائے اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھے اور فرمایا تمہارے ہاتھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا حضرت نے عرض کیا میں اس کا متحمل نہیں۔ البتہ ایک ایسا گھر چاہئے فرمایا یہ بھی ہو جائے گا جس کا غیب سے یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرت کے نام مکان خرید دیا۔ حضرت نے اس مکان میں بیٹھتے ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک میں رہوں گا پر میرے بعد یہ مکان دوسرے اغراض محمودہ کے لئے وقف ہے (۶) اور اس طرح کی شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کی

(۱) ہر تعمیر کو منع نہیں کہا بلکہ جس تعمیر میں مذکورہ قید پائی جائے اسی سے منع کیا ہے (۲) برا نہیں (۳) پسندیدہ ہے (۴) اسکی بنیاد کسی فساد پر مبنی نہ ہو (۵) فاقے برداشت کر لئے (۶) فوراً وقف نامہ لکھا کہ زندگی بھر میں رہونگا اس کے بعد یہ مکان اچھے کاموں کے لئے وقف ہے (یہ جگہ اب حرم مکہ میں شامل ہوگئی ہے) خلیل۔

اولاد کے انتفاع (۱) کی شرط لگالے یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے جس سے اولاد کو مجبوری کی وجہ سے مکان بیچنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلّہ ویران اور خطرناک ہوگیا یا ہمسائے شریر ہوگئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر وقف کی وجہ سے اس کی بیع (۲) نہیں کرسکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔

غرض مکان کے نہ ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ شیرازی بھی مقام امن کی ضرورت کو فرماتے ہیں۔

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

''مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق دوست اگر تم کو ہمیشہ میسر ہوجائیں تو بہت ہی اچھی توفیق ہے''

ہاں شرط یہ ہے کہ مقام امن ہو گڑ بڑ نہ ہو ورنہ پھر مکان سے خاک بھی فراغت نہیں ہوتی۔

مکان کی قدر

اپنے اختیار کی جگہ نہ ہونے کی تکلیف پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہم ایک دفعہ عدن میں اترے۔ عدن مشہور جگہ ہے اور یہ بھی عوام میں مشہور ہے کہ وہاں بہشت تھی مگر وہ جنت اسی قبیل سے ہے کہ تسمع بالمعید خیر من ان تراہ ''معید کو سن لینا اس کے دیکھنے سے بہتر ہے'' غرض یہ غلط مشہور ہے کہ وہاں بہشت ہے۔ تو میں جب عدن پہنچا ایک دو ساتھی اور بھی ہمراہ تھے۔ ہم کو عدن کی سیر کرتے کرتے شام ہوگئی۔ سوچا کہ مسجد میں جا کر سو رہیں گے کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں کسی کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسجد میں پہنچے چھت پر بستر بچھا کر چپکے سے لیٹ گئے۔

(۱) فائدہ اٹھانے کی شرط کرلے (۲) بیچ نہیں سکتے۔

تھوڑی دیر بعد مؤذن آیا اس نے آ کر کہا نکلو کون ہے میں نے دل میں کہا کہ ہم نے بھی بہت مسافروں کو مساجد سے نکالا ہے آج اس کی قدر ہوگی غرض ایک ساتھی نے مؤذن کو دھمکایا اور کہا کہ تمہیں خبر نہیں کہ ہم آتے جاتے ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں اور عربی میں کہا کہ تو جانتا نہیں ہم عرب ہیں۔ تو وہ مؤذن ذرا ٹھنڈا ہوا اور کہا کہ آ کر اندر مسجد میں لیٹ جاؤ۔ اس وقت ہم چھت سے اتر کر مسجد کے اندر آ گئے اور پردہ چھوڑ کر لیٹے اور کہا کہ خدا تیرا بھلا کرے تو واقعی مکان نہ ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم عاد کی تقلید

مگر مختصر مکان ضرورت کے لائق کافی ہے زیادہ اونچا مناسب نہیں حدیث میں ہے وبیت یتدخل فیہ کہ مکان ایسا ہو جس میں بہ تکلیف داخل ہوسکے زیادہ اونچا کرنا مکان کا قوم عاد کی میراث ہے قوم عاد شان کے لئے نئے نئے اونچے اونچے مکان بنایا کرتے تھے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں بھی بعض مکان اندر سے تو بہت ہی مختصر ہیں مگر دروازہ نہایت عالیشان اور نہایت بلند ہے عذر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوروں سے حفاظت رہتی ہے مگر یہ سب امور فضول اور لغو ہیں۔ چور تو جہاں چوری کرنا چاہتے ہیں تو اونچے سے اونچا مکان بھی مانع (۱) نہیں ہوسکتا۔ وہ تو نقب کے ذریعے سے کام کرتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں جن کے مکان بہت چھوٹے چھوٹے اور نیچے ہیں مگر چور ساری عمر میں بھی کبھی ان کے گھر نہیں آئے تو اونچے مکان کے لئے چور کا نہ آنا اور نیچے مکان کے واسطے چور کا آنا لازم نہیں چور کے آنے کے اسباب اور ہیں۔

غرض بلا ضرورت اونچا اور وسیع مکان بنانا فضول ہے بقدر ضرورت بنانا

(۱) رکاوٹ نہیں بنتا۔

چاہیے ہاں اگر کسی شخص کو ضرورت زیادہ ہو کہ آدمی بھی ہوں اور جانور بھی ان کی مقدار کے موافق وسعت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے غرض اللہ تعالیٰ نے نفس بنیان پر نکیر نہیں مذموم پر نکیر (۱) فرمایا چنانچہ اس کی ایک فرد کے باب میں فرمایا ہے کہ فانھا ربہ فی نار جھنم ''تو اس کو ساتھ لے کر دوزخ میں گر پڑی'' اور تاکید وعید کے لئے یہ بھی فرمایا وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ''اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا''

غرض یہاں دو مسجدوں کا ذکر ہوا ہے ایک وہ مسجد جس کی بناء میں غرض باطل اور نیت فاسد تھی (۲) اور ایک وہ جس میں غرض صحیح تھی یہ تو مساجد خاصہ تھیں جن کا ذکر اس مقام پر ہے اب میں ان سے اور مساجد کی طرف حکم کا تعدیہ (۳) کروں گا۔ پھر مدارس کی طرف پھر جملہ عمارات کی طرف مگر اول ایک غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

اہل فتاویٰ کی غلطی

یہاں پر بعض اہل فتاویٰ کو مساجد کے متعلق سخت غلطی ہوئی وہ یہ ہے کہ جب کسی قدیم مسجد کے مقابلہ میں کوئی جدید مسجد بنی تو انہوں نے جدید پر فوراً مسجد ضرار کا حکم لگایا کہ یہ مسجد فساد اور لڑائی کی وجہ سے ہے اور محض تفاخر پر مبنی ہے یہ یقینی امر ہے کہ اگر نیت مذکورہ ہے تو معصیت ضرور ہے مگر اس سے یہ حکم لگانا کہ مسجد ضرار ہے کیسے صحیح ہے غرض جو مسجد جدید بنی اس کو مسجد ضرار فوراً کہہ دیا اور الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ ''جو شئی ثابت ہوتی ہے وہ اپنے لوازمہ کے ساتھ ثابت ہوتی ہے''

(۱) نفس تعمیر کی برائی نہیں کی بلکہ بری نیت سے بنانے کی برائی کی ہے (۲) جس کی بنیاد برے مقصد کے لئے بری نیت سے رکھی تھی (۳) دوسری مساجد کا حکم بتاؤں گا۔

کے قاعدہ سے بعض اس سے آگے بڑھے کہ اس کے جلانے اور گرانے کا حکم کر دیا بے شک مسجد ضرار کا تو یہی حکم ہے مگر پہلے یہ ثابت ہو جاوے کہ یہ مسجد ضرار ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی تو بقیہ تفریعات (۱) ہو سکتی ہیں تو جو مسجد ریا اور تفاخر کے لئے بنائی جاوے مجھے اس کے مسجد ضرار کہنے میں کلام ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مسجد ضرار پر قیاس ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے (۲) کیونکہ مقیس علیہ (۳) میں تو درحقیقت مسجد ہی بنانے کی نیت نہ تھی کیونکہ ان کے اعتقاد سے مسجد بنانا موجب تقرب نہ تھا (۴) بخلاف مقیس (۵) کے کہ وہاں بانی مسجد بنانے ہی کی نیت کر رہا ہے اور مسجد بنانے کے موجب کو تقرب سمجھتا ہے گو اس میں نیت فاسد بھی ملی ہوئی ہے تو فساد نیت کو فساد عقیدہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ (۶)

اقسام مساجد

اصل یہ ہے کہ مساجد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مسجد صلوٰۃ ایک مسجد ضرار ایک مسجد صلوٰۃ وضرار یعنی ایک تو وہ جو محض نماز کے لئے ہو اور ایک وہ جو محض ضرار کے لئے ہو وہ مسجد ضرار ہے اور جو نماز اور اضرار دونوں کے لئے ہو وہ مسجد ضرار نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ مسجد ضرار کی اصل شرط یہ ہے کہ مسجد ہی بنانے کی نیت نہ ہو جو حاصل ہے آیت کا اور جب یہ شرط متحقق نہ ہو گو اور کوئی دوسری غرض بھی شامل ہو تو مسجد ضرار نہ ہوگی اس لئے احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے گو عنداللہ وہ مقبول نہ ہو۔

جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور نیت خالص نہ تھی تو گو وہ عنداللہ شہید نہ ہو مگر ظاہری احکام شہید کے تو اس پر لگائے ہی جاویں گے۔ غرض

(۱) باقی احکام مرتب ہوں گے (۲) یہ قیاس غلط ہے (۳) جس پر قیاس کیا جا رہا ہے (۴) قرب الٰہی کا موجب نہیں تھا (۵) بخلاف اس صورت کے جس پر قیاس کیا جا رہا ہے (۶) بری نیت کو برے عقیدہ پر قیاس کرنا درست نہیں۔

مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں (۱)۔فقہاء جن کی شان یہ تھی کہ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصٰھا کہ تمام جزئیات کا انہوں نے احاطہ کیا ہے مگر یہ جزئی کہیں ان سے منقول نہیں کہ مسجد بہ نیت ریا وغیرہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب منقول ہونے کا دعویٰ کریں تو مہربانی کر کے دکھائیں ہم نے کسی مجتہد سے کہیں یہ جزئی منقول نہیں دیکھی۔ باوجودیکہ فقہاء کے زمانہ میں بھی اس کی ضرور ضرورت ہوتی تھی۔ مگر فقہاء نے کہیں یہ تفریع (۲) نہیں کی حالانکہ احکام مساجد کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اور مسجد ہونا نہ ہونا احکام فقیہ میں سے ہے پھر عدم تعرض دلیل ہے (۳) اس امر کی کہ مسجد تفاخر وغیرہ کی نیت سے بنانا احکام ظاہری اور فقہی کے اعتبار سے مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے لہذا ہر مسجد کو ضرار کہہ دینا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

پھر جب ایسی مسجد مسجد ضرار کے حکم میں نہیں ہوسکتی تو یہ خیال کر کے کہ یہ مسجد ضرار ہے اس کے ویران کرنے کی کوشش جائز نہیں ہوسکتی پھر کسی کی نیت پر فتویٰ کا مدار کیونکر ہوسکتا ہے جب کہ نیت کا علم کسی کو سوائے خدا کے نہیں ہوسکتا پہلے اس شخص سے تو تحقیق کر لو جو بانی مسجد ہے ممکن ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو۔ (اور وہاں تو نیت کا حال وحی سے معلوم ہوگیا تھا اب بوجہ انقطاع وحی ہمیں نیت کا حال معلوم ہو نہیں سکتا) اور جس طرح کسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اسی طرح کسی مدرسہ پر بھی مدرسہ ضرار کا حکم نہیں لگا سکتے اس لئے کہ مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔

مدرسے اور کھالیں

جب ایک شہر میں مساجد متعدد ہوسکتی ہیں تو مدارس کے متعدد ہونے میں کیا

(۱) مسجد ہونا اور مقبول ہونا ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم نہیں (۲) کہیں یہ جزئیہ بیان نہیں کیا (۳) اس مسئلہ سے تعرض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ تفاخر کی نیت سے بھی اگر مسجد بنائی جائے تو اس پر مسجد ہی کے احکام جاری ہوں گے۔

مضائقہ ہے البتہ اسی طرح دو دو یا تین تین مدرسے چلانے سے کیا فائدہ جیسے مدارس آج کل چل رہے ہیں اور چلتے ہیں کہ جب قربانی کے دن آئے تو جہاں مدارس متعدد ہیں وہاں گھر گھر مدرسہ والے بھاگے پھرتے ہیں پھر ہر ایک اپنے مدرسہ کے لئے کھال لینے کی کوشش کرتا ہے جانوروں کی کھال اترنے سے پہلے آدمیوں کی کھال اترنے لگتی ہے اس قدر ذلیل افعال سے غیرت بھی تو نہیں آتی۔ ایسے مدرسہ کے چلانے سے کیا فائدہ؟ ایسی صورت میں تو مدرسہ والوں کو چاہئے کہ ایک جگہ دو مدرسے چلانے کا نام بھی نہ لیں۔ اور کھال کی کوشش تو مدرسہ والوں کو کسی حال میں بھی مناسب نہیں گو ایک ہی مدرسہ ہو۔ اس میں دوسرے اہل حاجت سے کشمکش ہوتی ہے چنانچہ جہاں پہلے سے قربانی کی کھال مؤذنوں کو دینے کی عادت تھی وہاں موذنوں کی کھال اترتی ہے جہاں بقرعید کے دن آئے اور مؤذنوں نے مدرسہ والوں کو دیکھا، کوسنا شروع کردیا کہ خدا ان مدرسہ والوں کو کھودے (۱)۔ انہوں نے ہماری آمدنی تباہ کردی غرض کھال کے قصہ میں مولویوں سے اکثر لوگ ناخوش ہیں تو علماء بلاضرورت کیوں مبغوض بنیں (۲)۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو دستاویز پر دستخط نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے عداوت ہوتی ہے اسی طرح علماء کو کھال کے قصہ میں بھی نہ پڑنا چاہئے کیونکہ یہ بھی باعث عداوت ہے (۳) اگر کہیں سے آ گئی لے لی ورنہ پھرنے پھرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسہ دیوبند پھر غنیمت ہے کہ وہ اس طرح کھالوں وغیرہ پر زور نہیں دیتے بلکہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں اوروں کا خیال کرتے ہو وہاں ہمارا بھی خیال کرلینا غرض علماء کو آزاد رہنا مناسب ہے۔ خوب کہا ہے۔

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند   خوشتر آں سرو کہ از بند غم آزاد آمد

''پھلدار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے''

خصوصاً جہاں کئی مدرسے ہیں وہاں تو بہت ہی چپقلش ہے اور کسی کا کسی پر

(۱) غارت کرے (۲) لوگوں کے بغض کا شکار بنیں (۳) دشمنی کا سبب ہے۔

بس تو چلتا نہیں لھذا مسجد ضرار و مدرسہ ضرار کے لقب سے ملقب کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں (۱) حالانکہ صاف اور واضح طور سے قرآن میں ایسے القاب سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ولا تنابزوا بالالقاب (۲) بلکہ اگر واقعی بھی کسی کا کوئی برا لقب ہو تو چڑانے کی نیت سے بھی نہ کہنا چاہیئے۔

تعمیر مساجد اور احتیاط

اب میں خاص مسجد کی خاص عمارت سے متعلق مساجد کی عمارت عامہ کی طرف حکم کا تعدیہ کرتا ہوں اور مساجد کی عمارات میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں ان کا مختصر بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل لوگ تعمیر مساجد میں اپنے کو شتر بے مہار سمجھتے ہیں (۳) کسی قسم کی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے اور اس جواب کو کافی خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنا گھر تو نہیں بناتے حالانکہ یہ جواب بالکل ناکافی ہے کیونکہ خدا کے گھر میں تو بدرجہ اولیٰ احتیاط کی ضرورت ہے وہاں احتیاط نہ کرنا زیادہ رنج و ملال کی بات ہے۔ چنانچہ مساجد میں گنبد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور استر کاری تو درجہ فرائض میں سے ہے۔ بلا ان امور (۴) کے تو مسجد مسجد ہی نہیں ہوسکتی۔ منارہ کو اس قدر طویل کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں اور منارہ کی طوالت کی اکثر یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ دور سے نظر آوے کہ مسجد ہے مگر یہ وجہ بھی صحیح نہیں بعض دفعہ آڑ ہوتی ہے وہ طویل منارہ بھی دور سے نظر نہیں آتا۔

علاوہ ازیں دور سے نظر آنا بھی ضروری نہیں منارہ بنانے کی اصل وجہ تو صرف یہ ہے کہ مسجد دوسری عمارات سے مشتبہ نہ ہو۔ منارہ مسجد ہونے کی علامت ہے اور وہ علامت نفس منارہ ہے نہ کہ منارہ کا اس قدر طول وطویل ہونا (۵)۔ سو علامت کے لئے چھوٹے چھوٹے گز گز بھر کے منارے کافی ہیں۔ یا بجائے منارہ کے اور کوئی علامت

(۱) دل کا غصہ نکالتے ہیں (۲) برے القاب سے نہ پکارو (۳) بالکل آزاد خیال کرتے ہیں (۴) ان کاموں کے بغیر (۵) مینارہ کا اتنا لمبا اونچا ہونا۔

کردی جائے۔ بعض لوگ طوالت منارہ کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شان اسلام ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ہے تو شان کے برابر تو لمبا ہونا چاہیے تھا پھر تو سب مساجد کے منارے کم از کم قطب کی لاٹھ کے برابر تو ہوتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسجد بننا تو دشوار ہی ہو جاتی ہے بس ایک منارہ پر ہی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ قطب کی لاٹھ کی بابت مشہور ہے کہ بادشاہ کا مسجد بنانے کا قصد تھا مگر اس وقت تک ایک ہی منارہ بنا تھا کہ بادشاہ صاحب چل بسے دوسرا منارہ نہ بنا اور نہ پوری مسجد بنی ورنہ معلوم نہیں کیا کیا تکلفات ہوتے ہماری ان رسوم سے ہماری مساجد کی واقعی وہی حالت ہو رہی ہے کہ مساجدھم عامرة وھی خراب کہ ظاہر میں تو مساجد آباد ہیں مگر باطن میں خراب ہیں۔ ان میں روح نہیں فقط ظاہر ہی ظاہر ہے۔ چنانچہ بمبئی کی یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو وہاں کی مساجد بے حد آباد ہیں لمبے لمبے اور بہت جھاڑ فانوس فرش فروش مگر سنت کے خلاف جماعت میں متفرق طور پر آدمی کھڑے رہتے ہیں اور پورے طور سے صف بندی بھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ مکہ مکرمہ کی تقلید ہے مگر وہاں تو خط مستقیم کھینچنا دشوار ہوتا ہے (۱) اس لئے کہ خانہ کعبہ کے رخ پر نماز پڑھتے ہیں اس لئے پورے طور سے صف بندی دشوار ہوتی ہے اس وجہ سے اکثر متفرق طور پر صفوف رہتی ہیں مگر بمبئی میں کوئی عذر نہیں۔ بمبئی والے نماز کے افعال و ہیئت میں اکثر مکہ والوں کی تقلید کرتے ہیں امام و مؤذن بھی زیادہ تر عرب ہی ہیں مگر یہ سب دین کی ظاہری صورت ہے اور باطنی حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک بدعات میں غرق ہیں۔

ایک ہمارے دوست طالب علم بمبئی میں ملے اور قصہ بیان کیا کہ ان سے کسی نے شیخ سدو کے بکرے کی بابت دریافت کیا انہوں نے ناجائز کہہ دیا بس شور مچ گیا اب جس مسجد میں جاتے ہیں وہاں حکم ہوتا ہے کہ نکالو وہابی ہے اس جہالت کی بھی کوئی

(۱) سیدھی صف بنانا مشکل ہے اس لئے کہ خانہ کعبہ کے چاروں طرف نماز پڑھی جاتی ہے

حد ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ہے ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا﴾ (۱) ’’اورکون شخص اس سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے انہیں روکے اوران کی بربادی میں کوشش کرے‘‘ غرض جس جگہ اور جس مسجد میں جاتے ہیں وہابی کہہ کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسجد شافعیہ کی تھی وہاں جا کر نماز پڑھی میں نے کہا کہ میاں فتویٰ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ دیا ہوتا کہ مجھے معلوم نہیں۔

غرض یہ بہانہ محض لغو ہے کہ مسجد کی زینت وآرائش سے شوکت اسلام بڑھتی ہے اسلام کی شوکت تو اتباع احکام سے بڑھتی ہے اگر ان آرائشوں سے شوکت اسلام بڑھا کرتی تو جس زمانہ میں شوکت اسلام عروج پر تھی اس زمانہ میں ان باتوں کا ضرور وجود ہوتا مگر ان چیزون کا کہیں پتہ نہیں۔

دیکھئے حضرت عمر h کتنے بڑے صاحب شوکت وسلطنت وسیاست تھے اور کس قدر عالی دماغ اور بلند حوصلے تھے لیکن جب مسجد نبوی بنوانے لگے تو بخاری میں ہے کہ مستری سے فرمایا کہ اکن الناس من الحرور والبرد یعنی مسجد ایسی بناؤ کہ گرمی اور بارش سے بچاؤ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عمر h نے باوجود کثرت فتوحات کے نقش ونگار کی اجازت نہیں دی۔ تو اس زمانہ میں قلت زینت مساجد کی وجہ سے کیا عروج اسلام میں کچھ کمی آ گئی تھی ہرگز نہیں بلکہ ایسا عروج تھا کہ آج مسلمان اس کو ترستے ہیں۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن پر جب مسجد بنی ہے تو معمار نے اس میں نقش ونگار بھی نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ خربوزہ اور تربوز بنانے شروع کر دیئے۔ منتظم نے روکا کہ یہ قصہ مت کرو اور میرا حوالہ دیا کہ وہ پسند نہ کرے گا۔ معمار نے کہا کہ اگر وہ پسند نہ کرے گا تو مزدوری نہ دینا۔ منتظم نے کہا کہ یہ تو یقینی امر ہے کہ وہ پسند نہ کریں گے پھر مزدوری بھی یقینی طور پر نہ ملے گی۔ معمار نے اس کو بھی منظور کیا پھر میرا مسجد دیکھنے کی

(۱) سورۂ بقرہ: ۱۱۴۔

غرض سے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے سب نقش و نگار دھلوا کر صاف کرا دیئے۔ اور معامر (۱) کو موافق وعدہ (نیز بوجہ قاعدہ شرعیہ) اجرت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مسجد میں اس طرح سے نقش و نگار کئے جاویں تو مسجد مسجد نہیں رہتی بلکہ تماشا گاہ ہوجاتی ہے کہ سیاح اس کو دیکھنے کو آتے ہیں اور نمازی بھی اگر وہاں نماز پڑھتے ہیں تو خیال نقش و نگار کی طرف رہتا ہے نماز کی طرف نہیں رہتا جب مساجد میں ان خرافات کی اجازت نہیں اور مساجد میں یہ خرافات فضول ہیں حالانکہ ان کی زینت یا شوکت میں ایک گونہ دینی مصلحت بھی محتمل ہے (۲) تو بقیہ عمارات میں بدرجہ اولیٰ یہ قصہ فضول ہے۔

مکان اور تقویٰ

غرض عمارات میں ریا و تفاخر و اسراف سے تحرز لازم ہے (۳) ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان (۴) کی ضرورت ہے اگر دونوں جمع ہوجائیں۔ سبحان اللہ! ورنہ صرف تقویٰ بھی بدرجہ ادنیٰ کافی ہے اور تقویٰ اور رضوان میں جو فرق ہے اس کو بیان کرتا ہوں۔

طلب رضوان (۵) جو وجودیات سے ہے اور تقویٰ عدمیات (٦) سے یعنی طلب رضوان کا حاصل ثواب کے لئے فعل مامورات ہے (۷) خواہ واجب ہوں یا مستحب اور تقویٰ کا حاصل احتراز عن المنہیات ہے (۸) پھر تقویٰ اور رضوان کو یہاں لفظ ''واؤ'' سے جمع کیا گیا ہے اور لفظ ''واؤ'' ہر چند کہ جمع کے لئے آتا ہے مگر اجتماع کے لئے نہیں آتا پس ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کا جمع کرنا ضروری نہیں کیونکہ عمارت کی دو قسمیں ہیں بعضی عمارت جیسے مساجد وغیرہ میں تو رضوان و تقویٰ کا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ نیت بھی ثواب کی ہوتی ہے اور خلاف شرع افعال و نیت سے

(۱) مسجد تعمیر کرنے والوں کو وعدے کے موافق (۲) دینی مصلحت کا بھی احتمال ہے (۳) دکھاوے فخر اور فضول خرچی سے بچنا ضروری ہے (۴) ہر تعمیر کرتے وقت تقویٰ اور پرہیزگاری کی ضرورت ہے (۵) اللہ کی خوشنودی کی طلب (٦) خوشنودی افعال وجودیہ اور تقویٰ افعال عدمیہ میں سے ہے (۷) جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے (۸) جن کاموں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنا ہے۔

بھی بچنا ضروری ہوتا ہے اور اگر اپنا مکان بناویں تو اس میں تقویٰ تو ہر حال میں ضروری ہے لیکن رضوان و ثواب کی رعایت قدرے مشکل ہے اگر اس میں بھی رضوان و ثواب کا قصد شرعاً ضروری ہوتا تو ہم اس صورت میں مکان بنانے میں خوشنودی خداوندی کی آخر کیا نیت کرتے تکلف ہی کرنا پڑتا چاہے حق تعالیٰ ہمیں کسی نیک نیت پر جو ہم بہ تکلف کرلیں ثواب دے دیں مگر نیت کرنا خود ہوتا تکلف۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کے ایک مرید نے مکان بنایا تھا تو وہ بزرگ مکان دیکھنے تشریف لائے دریافت کیا کہ بھائی یہ روشندان کیوں رکھا ہے عرض کیا کہ حضور روشنی کے واسطے فرمایا اگر یہ نیت کرلیتے کہ اس میں سے آذان کی آواز آئیگی تو ثواب بھی ملتا اور روشنی تو ہر صورت میں ہوتی ہی ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ ہر فعل میں اس قسم کی نیت ہے مشکل یہ خاص لوگوں کا کام ہے۔اسی لئے میں کہتا ہوں کہ رضوان کی رعایت ہر عمارت میں مامور بہ نہیں۔ (۱) ہاں اگر نیت خیر ہو اس کے مستحب ہونے میں کلام بھی نہیں، مگر سب میں ایسی ہمت کہاں کہ کھانا کھاوے، چلے پھرے، ہر ایک فعل مباح میں کوئی خاص نیت کرے عوام اگر نیت کریں گے بھی تو محض درجہ لفظ میں ہوگی نہ کہ حقیقۃً۔ بہرحال ہر کام میں ایسی نیت دشوار ہے نتیجہ اس کاوش کا یہ ہوتا کہ غیر ضروری نیت کے ساتھ ضروری نیت بھی چھوٹ جاتی۔

جیسے ایک صاحب کو میں نے دیکھا میزان پڑھانے بیٹھے تو الحمدللہ میں تقریر کرنے لگے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔استغراق اور جنس اور عہد ذہنی اور عہد خارجی وغیرہ۔حالت یہ تھی کہ وہ بیان کررہے تھے اور طلباء ان کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان پڑھنے والوں کے نزدیک تو الف لام کی ایک ہی قسم ہے یعنی استغراق کیونکہ یہ بیچارے سب مستغرق ہوگئے تو وہ مبتدی جس نے میزان شروع کی ہے ان باتوں کو کیا سمجھ سکتا ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے۔بجز اس کے کچھ

(۱) ہر عمارت بنانے میں رضامندی الٰہی کا حکم نہیں ہے۔

نہیں کہ جب سمجھ نہ آوے تو چھوڑ دے تو نتیجہ اس دشواری کا اکثر ضروری چیز کا بھی ترک ہوتا ہے۔ اکثر واعظین اس قسم کی حکایت عوام کے سامنے بیان کر دیتے ہیں اور ان کا درجہ بیان کرتے نہیں عوام ان کو ضروری سمجھ جاتے ہیں جس سے ان سب امور کا نتیجہ ترک عمل ہوتا ہے (۱) اگر ہر عمارت میں طلب رضوان وثواب کی نیت کا مکلّف بنایا جائے تو عوام تقویٰ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے غرض عمارت کے لئے دو چیزوں میں سے بطور مانعۃ الخلو (۲) کے کسی ایک کی ضرورت ہے تقویٰ یا رضوان کی اور اس لفظ واؤ سے تقویٰ اور رضوان کا مجتمعاً پایا جانا ضروری نہیں ہو گیا (۳)۔ کیونکہ یہاں تو واؤ سے فقط حکم میں دونوں کو جمع کرنا منظور ہے نہ کہ وجود میں اور وہ حکم ہے (۴) خیریت۔ تو یہاں جمع فی الخیریت مراد ہے کہ خیر ہونے میں دونوں شریک ہیں پس ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان دونوں باتوں کو مجتمع کرے بلکہ بعض عمارات میں جہاں رضوان وثواب کی نیت میں تکلیف ہو، صرف تقویٰ بھی کافی ہے۔

مکان اور ضرورت

اب تقویٰ کی مختصر فہرست بتلاتا ہوں جس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بے ضرورت مکان نہ بناؤ یہ بھی خلاف تقویٰ ہے جب ضرورت ہی شدید ہو تو مجبوری ہے حدیث میں آیا ہے کہ سب چیزوں میں اجر ملتا ہے مگر عمارات کہ اس میں اجر نہیں ملتا اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارات میں زیادتی ہو ہی جاتی ہے اور میں خود اس خبط میں مبتلا ہوں کہیں ذرا سا گوشہ نکلا ہوا برا معلوم ہوتا ہے کہیں نیچا ہے اس کا مساوی کرنا ہے۔ کہیں صرف اس ضرورت سے کہ مقابلہ ٹھیک نہیں ہوتا کوئی چیز بنائی جاتی ہے۔ اگر دروازہ سے پورا تقابل نہیں ہوتا تو مقابلہ میں دروں کے نشان بلاضرورت ڈالتے ہیں۔

(۱) ان سب کاموں کا نتیجہ عمل کو ترک کرنا ہو جاتا ہے (۲) دونوں میں سے ایک ہونا چاہئے خالی الذہن نہ ہو (۳) تقویٰ اور خوشنودی کا جمع ہونا ضروری نہیں (۴) واؤ جمع اس لئے لائے کہ دونوں حکم میں جمع ہیں۔

غرض عمارت وبال ہے(۱) البتہ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ حدیث میں او بیت یدخل فیہ (یا ایسا گھر جس میں بہ تکلف داخل ہو سکے) وارد ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف قسم کی ہوتی ہے اس لئے اختصار بھی ہر ایک کے لحاظ سے مختلف ہے۔

معیار ضرورت

جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک شخص آٹھ دس روٹی کھایا کرتا تھا لوگوں نے شکایت کی بزرگ نے نصیحت کی کہ بھائی کم کھانا چاہئے۔ خیر الامور اوساطھا اس نے عرض کیا حضرت میری خوراک چالیس روٹیاں ہے اس لئے میرا اوسط یہی ہے بلکہ اوسط سے بھی کم ہے غرض ہر شخص کی ضرورت جدا ہے۔ ایک شخص ہے کہ اس کے گھوڑے وغیرہ بھی ہیں اس کو ان وجوہ سے بڑے مکان کی حاجت ہے اس لئے ہر شخص کا اوسط جدا ہے۔ غرض حد ضرورت میں تعمیر کرنا چاہیے اور ضرورت سے زائد کو ترک کرنا چاہیے۔

آسائش وآرائش

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو آسائش ہے اور ایک آرائش ہے آسائش کی مقدار تک تو مکانوں میں وسعت جائز ہے۔ مگر آرائش کا اہتمام مذموم ہے (۲)۔ خصوص جب ساتھ میں نمائش بھی ہو۔ بس ہر عمارت میں یہ امر ضروری اور قابل لحاظ ہے کہ یہ تعمیر آسائش کے واسطے یا آرائش ونمائش کے واسطے ہے تو جو عمارتیں آرائش ونمائش کے واسطے ہوں وہ تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اور اکثر عمارات تو ایسی ہی ہیں جن میں ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جاتا چنانچہ بعض مکانوں میں دروازے بہت بلند ہیں بلکہ بعضے مکان تو ایسے ہیں کہ دروازہ تو نہایت عالیشان مگر اندر سے مکان بہت ہی مختصر وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا، کھول کے دیکھا تو آدھا پڑا۔ پرانی عمارتوں میں

(۱) ایک مصیبت ہی ہے (۲) برا ہے۔

اکثرت ایسے دروازے دیکھے جاتے ہیں جو ٹھیک اس شعر کے مصداق ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدید ست صنا دید عجم را

''شایان عجم کے آثار نقش و نگار اور ٹوٹی ہوئی دیواروں سے ظاہر ہیں''

ان مکانوں میں اکثر مکان ایسے بنائے گئے ہیں کہ جس لاگت میں ان کے دروازے بنے ہیں اتنی لاگت میں دو تین حویلیاں تیار ہوسکتی تھیں تو اس کو سوائے آرائش بلکہ نمائش کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

میرے ایک عزیز تھے انہوں نے تین سو روپیہ میں ایک حویلی خرید لی جس میں ایسا عالیشان برج تھا کہ تین سو روپیہ کا تو وہی ہوگا اور اندر سے مکان کچھ بھی نہیں۔ غرض آج کل شان اور فخر سے بہت کام لیا جاتا ہے معمولی مکان بنانے سے عار آتی ہے۔

عشق اور وظیفہ

یہ عار وہ بلا ہے کہ انسان کو تباہ کردیتی ہے اسی عار ہی کی وجہ سے ابوطالب مقصود سے رہ گئے حالانکہ وہ حضور ﷺ کے عاشق اور جانثار تھے۔ حضور ﷺ نے مرتے وقت ان سے فرمایا کہ ایک دفعہ کلمہ کہہ دو۔ احج بھا ربی (اپنے رب کے سامنے اس کو حجت میں پیش کروں گا) اس وقت ابوجہل بھی پاس بیٹھا تھا کہنے لگا اترغب عن ملة قریش (کیا تم قریش کی ملت سے اعراض کرتے ہو) تو ابوطالب حضور ﷺ سے کہنے لگے کہ میرے بھتیجے! میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کردیتا مگر لوگ کہیں گے کہ ابوطالب نے عذاب کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیا۔ غرض آخر کلمہ ان کی زبان سے یہ نکلا ھو علی دین عبدالمطلب (وہ حضرت عبدالمطلب کے دین پر ہیں)

غرض یہ عار وہ بلا ہے جس کی وجہ سے ابوطالب ایمان نہ لاسکے پس اس کا علاج کرو اور اس کا علاج وظیفوں کا پڑھنا نہیں بلکہ عشق پیدا کرلو یہ اس سے ضرور جاتا رہے گا مولانا فرماتے ہیں:

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد　　او زحرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب اطراف کا علاج ہو جاتا ہے۔ اے عشق تو ہمارے لئے نخوت و ناموس کی دوا ہے تو ہمارے لئے افلاطون و جالینوس ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت　　ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند　　در نگر آخر کہ بعلو لاچہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت　　مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو وہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الٰہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ اس کے بعد دیکھو کہ کیا رہ گیا۔ الا اللہ باقی رہ گیا تمام فنا ہو گئے۔ اے عشق شرکت سوز تجھ پر مرحبا کہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیا۔

حصولِ عشق الٰہی کا طریقہ

اور خود یہ عشق بھی وظیفوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ صحبت سے پیدا ہوتا ہے جیسے خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے جس کی تدبیر یہ ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

قال کو چھوڑو، حال پیدا کرو، حال پیدا کرنے کے لئے کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرو۔

تو عشق کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عشاق کی صحبت اختیار کرو یعنی

ان کا اتباع اور انقیاد کرو(۱) جو تجویز کریں اور تعلیم کریں اس پر عمل کرو، یاد رکھو وہ وظیفہ نہ بتاویں گے نہ وہ اپنے پاؤں دبواویں گے بلکہ لوگوں کی خدمت کراویں گے ان امور کو جان و دل سے قبول کرنا چاہیے گو نفس کو ناگوار ہو۔

صبر کن درکار خضر اے بے نفاق تا نہ گوید خضر روہذا فراق

خضر کے کام میں صبر کرو تا کہ خضر کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ چلتے بنو۔ یہ جدائی ہے۔
مگر یہ سختی چند ہی روز ہوتی ہے پھر ان سے بڑھ کر کوئی شفیق نہیں ہوتا۔

بزرگوں کی سختی

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے میں ان کی خدمت میں دو دفعہ گیا آخری مرتبہ ان کی ایسی شفقت تھی کہ جب میں روانگی کی اجازت چاہتا تھا فرماتے تھے کیا جلدی ہے مگر اول مرتبہ لہجہ تند تھا اور خفگی نمایاں تھی۔ اکثر خفگی اور تندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان حضرات کو خلاف سنت سے تنگی ہوتی ہے چنانچہ مسجد میں جاتے وقت کوئی بایاں پیر پہلے رکھ دیتا تو مولانا کو ناگوار ہوتا تھا اور غصہ آجاتا تھا مجھ سے جس مرتبہ تند لہجہ میں بولے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں رات کو گیا تھا اور حدیث میں رات کو جانے کی ممانعت آئی ہے لہذا خفگی ہوئی مگر میں نے سمجھا کہ یہ خفگی میرے لئے اصلاح ہے۔ اس لئے ذرا ناگوار نہ ہوئی بلکہ دوبارہ پھر حاضر ہوا اس وقت مولانا غایت شفقت سے پیش آئے اور حصن حصین کا درس شروع کرادیا اور حدیث وغیرہ کی اجازت دی اور بہت توجہ فرمائی۔

پس بزرگوں کی خفگی کو چند روز برداشت کرلو تم کو وہ اپنی دولت سے رنگ دیں گے اور اگر خفگی کی وجہ سے کوئی ان سے بھاگے تو ان حضرات کا اس میں کیا نقصان ہے اپنا ہی نقصان ہے افسوس عشق کی طلب اور ذرا سی خفگی سے ناگواری۔

(۱) ان کی پیروی اور کہنا مانو۔

تو بیک زخمے گریزانی زعشق　　تو بجز نامے چہ می دانی زعشق

’’تو ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتا ہے تو بجز نام کے عشق کی حقیقت سے واقف نہیں‘‘

اور خود ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کو برا بھی کہے تو ان کو اس کی بھی پرواہ نہیں بقول حافظ:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

’’اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کی پرواہ نہیں کرتے‘‘

نہ یہ تکلفات جانتے ہیں، تکلفات کے متعلق ان کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ خرقہ کو بھی (۱) تکلف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شباب اولیٰ　　دیں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

’’یہ خرقہ جو میرے پاس ہے شراب محبت میں گروی رکھنا بہتر ہے یہ دفتر بے معنی محبت الٰہی کی خاص شراب میں ڈبونا بہتر ہے‘‘

اس شراب سے مراد شراب محبت ہے یعنی اس خرقہ کو شراب محبت میں ڈبونا چاہئے ورنہ بدوں اس کے وہ آگ میں جلانے کے قابل ہے کما قال۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بےغش باشد　　اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

’’صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست اور بےغش نہ ہو وہ صوفی ہی نہیں اگرچہ خرقہ پہن (۲) لے۔ اے شخص بہت سے خرقے آگ میں جلانے کے قابل ہیں‘‘

بہت لوگ خرقہ پہن کر عجب و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں صوفی نہیں ان میں کھوٹ ہے ان کو ابھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ خناس دماغ سے نکلے اگر یہ خناس موجود ہے تو حقیقت میں وہ صوفی نہیں جب یہ خناس نکل

(۱) فقیرانہ لباس (۲) غرور تکبر۔

جاوے گا تب صوفی ہوگا اس وقت یہ حال ہوگا کہ نہ جاہ کی طلب رہے گی نہ عزت کی بلکہ ہر حال پر راضی ہوکر کہے گا‘

زندہ کنی عطائے تو ورنکشی فدائے تو　　جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

’’زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں۔ جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں‘‘

جب یہ حالت ہوجاوے گی تب عشق پیدا ہوجاوے گا۔اور جب عشق پیدا ہوگا اس سے نخوت (۱) بخود بخود جاتی رہے گی پس تفاخر کا علاج یہی ہے کہ عشق پیدا کرو اور جب تک عشق پیدا نہ ہوگا (۲) اس وقت تک عمارت میں لباس میں وضع قطع میں ہر چیز میں یقیناً تفاخر پیدا ہوگا اور اس سے بچنا دشوار اور قریب بہ محال ہوگا غرض ایک امر تقویٰ کے خلاف تو یہ ہے کہ عمارت فضول اور بے ضرورت بناتے ہیں۔

تواضع اور رحم کا فقدان

دوسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ اپنی عمارت کی اصلاح کے لئے جس کی زمین پاس دیکھی دبالی تاکہ اپنی عمارت نہ بگڑے صاحبو! افسوس ہے کہ پہلے زمانہ میں تو کفار سلاطین بھی ایسا نہ کرتے تھے پھر حیرت ہے کہ ہم مسلمان اور ضعیف القدرت ہوکر یہ حرکتیں کریں۔

نوشیرواں بادشاہ تھا جب اس نے اپنا محل بنانا چاہا تو ایک بڑھیا کا مکان محل کے قریب تھا جس کے ملانے کی ضرورت تھی ورنہ محل میں ریخ رہتا تھا (۳) مگر اس نے دینے سے انکار کردیا تو نوشیرواں نے اس پر زور نہ دیا اور نہ جبر کیا بلکہ اپنا مکان ٹیڑھا ہی بنالیا اور ایک گوشہ (۴) کے بگڑنے کا خیال نہ کیا۔

اصل یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں طبعاً عقلاً خلوص اور تواضع اور حفاظت

(۱) تکبر وغرور (۲) جذبہ فخر پیدا نہ ہوگا (۳) ٹیڑھا پن (۴) کونہ خراب ہوجانے کی پروانہ کی۔

حدود تھی اسی لئے ان کی تعمیرات پائیدار اور مضبوط اور خوشنما بھی ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی ہے کہ کسی کی زمین پاس ہے اس کو دیکھ کر آدمی باؤلا بن جاتا ہے کہ کسی طرح یہ بھی میرے مکان کے اندر آجائے اور اگر کسی غریب اور کمزور کی ہے تو روز بروز اپنی عمارت کو تھوڑا تھوڑا ادھر کھسکانا شروع کردیتا ہے سچ یہ ہے کہ آج کل تواضع اور رحم بالکل نہیں اور اس کے فقدان [1] سے آخرت کا تو ضرر ہے ہی مشاہدہ ہے کہ عمارت بھی ناپائیدار ہوتی ہے۔

تواضع کی حقیقت

تواضع کے ذکر پر اس کے متعلق ایک ضروری بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ تواضع سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم چھوٹوں کو اپنے سر پر بٹھاؤ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو، کسی کا حق ضائع نہ کرو، نہ کسی کا حق دباؤ اور بعض بزرگوں سے جو ایسے واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے چھوٹوں کو سرہانے بٹھلالیا تو یہ غلبہ حال ہے بعض اہل حال بزرگوں پر تواضع کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

بزرگوں کی تواضع

چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب ایک مرتبہ پائنتی بیٹھے تھے حجام خط بنانے کے واسطے آیا تو آپ نے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر بنادو۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ سرہانے بیٹھ جاویں۔ فرمایا اگر تمہیں خط بنانا ہو، تو یہیں بیٹھ کر بنادو، ورنہ پھر کسی وقت جب مجھے سرہانے بیٹھا دیکھو اس وقت آکر بنادینا۔ اب تو میں اٹھ کر سرہانے نہیں بیٹھتا وہ حجام مجبور ہوگیا اور سرہانے بیٹھ کر ہی خط بنانا شروع کردیا۔

مگر یہ غلبہ حال ہے اس وقت مولانا پر کوئی خاص کیفیت تھی سب بزرگوں کا ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض دفعہ بزرگ جن پر اس حالت کا غلبہ نہیں ہوتا اپنے

(۱) اس کے نہ ہونے سے۔

چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرتے ہیں کیونکہ انہیں قرائن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر ہم اس درجہ تواضع کریں گے تو چھوٹوں کو تکلیف ہوگی یا گرانی ہوگی یا اس کے لئے مضر ہوگا اس مصلحت سے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ معاملہ چھوٹوں کا سا کرتے ہیں اور تواضع نہیں کرتے لیکن اگر کوئی بزرگ تواضعاً ایسا کریں بھی تب بھی چھوٹوں کو نہ چاہیے کہ ان کے سرہانے بیٹھیں اور حکم موکدہ اس سے مستثنیٰ ہے(۱)۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر ایسی تواضع کا خاص طور پر مذاق غالب تھا۔ چنانچہ ایک بار مولانا تھانہ بھون تشریف لائے اور آپ کا وعظ ہوا تو مولانا پائنتی بیٹھے تھے اور ہماری قوم کے شیخ زادہ(۲) کو دیکھئے کہ وہ مولانا کے سرہانے بیٹھے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے اگر مولانا سرہانے نہ بیٹھے تھے تو ان لوگوں کو یہ زیبا تھا(۳) کہ اس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم وتکریم بھی نہ کریں۔ مگر مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ ان کو اپنے سرہانے کسی کے بیٹھنے سے ذرا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو قصداً پائنتی بیٹھتے تھے مگر بعض کا مذاق دوسرا ہوتا تھا۔

بزرگوں کی شانیں مختلف ہیں

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرنا چاہئے اس سے ان کا دل خوش ہوتا ہے چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجھے عزیزم میاں اشرف علی لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب خط میں مخدوم ومکرم وغیرہ الفاظ لکھتے میں نے ایک مرتبہ

(۱) البتہ اگر وہ اس بات کا تاکید سے حکم دیں تو دوسری بات ہے کیونکہ الامر فوق الادب (۲) ہندوستان میں شیخ زادگان سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی اور علویوں کو کہتے ہیں، یعنی جو حضرت فاطمہ، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی اولاد میں سے ہوں (۳) مناسب تھا۔

عریضہ (۱) لکھا کہ حضرت سے یہ تو توقع نہیں کہ حضرت چھوٹوں کے القاب سے مجھے یاد فرماویں اس لئے اگر حضرت عنایت فرماوغیرہ تحریر فرمادیا کریں تو بھی گوارا کرلوں گا پھر اس کے جواب میں جو خط آیا اس میں بھی وہی مخدوم ومکرم وغیرہ القاب موجود تھے۔

حضرت مولانا سلمہ علیہ الرحمۃ پر بھی تواضع کا ذوق غالب تھا اور حکماء شرح پر یہ مذاق غالب ہے کہ اگر کوئی چھوٹا شخص ان کی پائینتیوں بیٹھتا ہے تو بیٹھنے دیتے ہیں اہتمام کرکے اس کو اپنے سرہانے نہیں بٹھلاتے لیکن اگر وہ چھوٹا پہلے سے سرہانے بیٹھا ہو تو خود اہتمام کرکے اس کے سرہانے بھی جاکر نہیں بیٹھتے۔ مگر ہماری نخوت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کہیں مجلس میں جائیں اور کوئی غریب آدمی سرہانے کی طرف پہلے سے بیٹھا ہو تو اس کو دھکا کر پائینتی کی طرف کرکے خود سرہانے بیٹھیں گے۔

عبادات اور نخوت

بھلا یہ تو عادات میں نخوت تھی بعض متکبرین تو عبادات میں بھی نخوت (۲) کرتے ہیں۔ کالپی کی مسجد میں ایک داروغہ صاحب تشریف لائے اور ایک بچارا گندھی (۳) مسافر تاجر بھی اسی مسجد میں آیا داروغہ صاحب نے نماز بہت جلدی جلدی پڑھی جب وہ سلام پھیر چکے تو اس گندھی نے کہا کہ آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی داروغہ کو گندھی کی اصلاح بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کو دھمکایا کہ تو ہمیں اصلاح دیتا ہے گندھی نے کہا صاحب چاہے آپ پٹوا لیجئے مگر نماز کا اعادہ (۴) کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ اور لوگوں نے جو وہاں حاضر تھے ان سے کہا کہ داروغہ جی اس میں آپ کا نقصان ہی کیا ہے آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ خیر انہوں نے مجبور ہوکر نماز کا اعادہ کیا اب تو وہ گندھی صاحب مشہور ہوگئے۔ جدھر جاتے ہیں لوگ بلاتے ہیں کہ حضرت یہاں آئے۔ ہر ایک اپنے پاس آنے کی درخواست کرتا ہے خوب عطر تیل کی بکری ہوئی اور تعظیم تکریم بھی ہوئی اور واقعی ان کی یہ

(۱) خط (۲) تکبر (۳) عطر بیچنے والا (۴) نماز دوبارہ پڑھ لیجئے۔۔

بات تھی بھی تعظیم کے لائق دیکھئے ان داروغہ نے عبادات میں بھی نخوت سے کام لیا۔

ہماری اکثر یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو متواضع ہیں بات بات پر خاکساری ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نصیحت کردے تو یہ حال ہوجاتا ہے: ﴿وَاِذَاقِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ﴾ ''جبکہ اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر تو اس کو عزت گناہ کے ساتھ پکڑ لیتی ہے''

پس ہماری تواضع محض تصنع ہے بقول مولانا

کہ گہے آہے دروغے میزنی　　از برائے مسکہ دوغے میزنی

''تو کبھی کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے''

مگر بناوٹ سے کام نہیں چل سکتا نہ تصنع حق تعالیٰ پر مخفی رہ سکتا ہے۔(۱)

کار با او راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

''کام اس کے ساتھ درست رکھنا چاہئے۔ اخلاص اور صدق کا علم بلند کرنا چاہئے''

عشق پیدا کرنے کی تدبیر

غرض یہ نخوت بہت ہی بری چیز ہے اور یہ عشق ہی سے زائل ہوتی ہے اور عشق کے پیدا کرنے کی تدبیر جیسا اوپر مذکور ہوا صحبت عشاق ہے اور جب تک صحبت عشاق میسر نہ ہو اس وقت تک یہ تدبیر کی جاوے کہ ذلت کے افعال اختیار کئے جائیں اور متواضعین کے طریقہ کو بتکلف دستور العمل بنایا جاوے مثلاً کوئی مسجد میں نماز کی غرض سے آوے، کسے باشد (۲) اس کے واسطے لوٹا بھر کر رکھ دیا یا اس کے جوتے اٹھا کر رکھ دیئے اس لئے کہ:

النفس کالطفل ان تھمل شب علی　　حب الرضاع وان تفطمع ینفطم

یعنی نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اس کو جیسے کاموں کی عادت ڈالوگے اسی کا

(۱) نہ دکھاوا اللہ سے چھپا رہتا ہے (۲) کوئی بھی ہو۔

اثر قبول کرلے گا پس ابتداء ہی میں نفس کو ذلت کے کاموں کا عادی کرو پہلے ہی دن بڑے بننے کی فکر نہ کرو۔ جیسا ابھی مذکور ہوا ابتداء میں یہ کام کرو کہ مسجد میں جا کر فرش بچھادیا اور اذان کہہ دی۔ کیونکہ آج کل لوگ اذان کہنے کو بھی بہت عیب خیال کرتے ہیں اور موذن کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں اس سے نخوت کا علاج ہوجاوے گا۔ جس کی وجہ سے عمارات میں کسی کا حق دبانے کا خیال ہوجاتا ہے اگر تم سب کو اپنے سے بڑا سمجھو تو پھر ایسی بے راہی کی کبھی ہمت نہ ہو۔

تعمیر میں خلوص کا اثر

غرض مکان بنانے میں اس کی رعایت رکھو کہ کسی کی زمین نہ دباؤ۔ کسی کی زمین میں دروازہ مت کھولو کسی کی ملک میں نالی نہ بنالو۔ مجھے ایک مکان کی ضرورت تھی اس لئے میں نے ایک مکان خریدا اس مکان کا جو صدر دروازہ تھا اس کی بابت لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ دروازہ دوسرے کی زمین میں بنا ہوا ہے گو صدر دروازہ کے لائق وہی جگہ تھی مگر میں نے اسے بند کرادیا اور بند بھی اس طرح کرایا کہ اینٹ نکلوا کر بطور اتصال تربیع کے ردہ سے ردہ ملوادیا(۱) تاکہ کبھی ملک کا شبہ تک نہ رہے۔ اگر کوئی زمیندار اس مکان کو خریدتا تو ایسے موقع کو غنیمت خیال کرتا مہتمم تعمیر (۲) نے اس سمت میں باجازت مالکان زمین موریاں (۳) رکھ دی تھیں میں نے ان کو بھی بند کرادیا کیونکہ اب تو یہ تبرع ہے (۴) پھر یہی حق سمجھا جانے لگے گا تو مکان میں ان امور کا لحاظ رکھا جاوے۔

تیسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ تعمیر میں حرام مال نہ لگایا جاوے ورنہ بروئے حدیث ویرانی کی جڑ یہی ہے تھانہ بھون میں پیر محمد صاحب کی مسجد عالمگیر کے وقت کی ہے جس کی دیواریں اور گنبد گارے کے ہیں۔ مگر پائیداری کی اس کے

(۱) اینٹ سے اینٹ جوڑ کر دیوار بنائی (۲) ٹھیکے دار نے (۳) سوراخ (۴) بطور استحسان۔

سوا اور کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ مال حلال تھا اور نیت میں خلوص تھا اور جو شخص تعمیر میں ان امور کی رعایت نہ کر سکے تو مثل مشہور شعر گفتن چہ ضرور(۱)، وہ تعمیر ہی نہ کرے اور ان امور کی رعایت تو قدر ضرورت کی تعمیر میں ہے باقی ضرورت سے زیادہ تعمیر تو اصل ہی سے ناپسند ہے اس کی نسبت ختم آیت پر فرماتے ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔ یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے آگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔فرماتے ہیں:﴿ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيْبَةً فِي قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾(۲) ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی (ہاں مگر ان کے دل ہی فنا ہو جائیں) کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ۔ اور پھر اوپر سے منہدم (۳) کردی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا ہاں ان کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ ارمان بھی اس وقت ختم ہو جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ان کی مخفی شرارتوں کو جانتے ہیں۔ حکمت والے ہیں۔ مناسب سزا دیں گے تو آدمی جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی ہے وہی حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی اور یہ علت بھی مشترک ہے تمام عمارات میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارات ایسے ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوگئیں اور ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہوگئی۔ چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام نہیں ہوتا۔

(۱) شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے (۲) سورۂ توبہ: ۱۱۰ (۳) گرادی گئی۔

قلب اور موت

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا بجز اس کے کہ ان کے دل ہی قطع ہوجاویں اور یہ مرجاویں تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے کیونکہ جب دل ہی نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا پس ایک تو یہ توجیہ ہے الا ان تقطع قلوبھم کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے راحت ہوجاوے گی۔

ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے۔ کہ الا ان تقطع قلوبھم (ہاں ان کے دل فنا ہوجائیں) تاکید ہے وہ الم حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک دور نہ ہوگی کیونکہ قلب کو موت نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مضغہ صنوبری ہے [1]۔

اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکیم بھی ہے کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب جزا اور سزا دیتے ہیں۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے۔ عقائد وغیرہ کا حصول بھی اسی قلب سے ہوتا ہے۔ یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقا ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اخلاق جو ناپاک ہیں وہ بھی ہمیشہ باقی رہتے ہیں عشق کا ذب بھی باقی رہتا ہے اس لئے کفر بھی باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہوجاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوٹتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے رستگار ہوجانے کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں بالکل غلط ہے اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ اس کی کیفیات زائل ہوتی ہیں۔ غرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے تو چونکہ قلب

(۱) جسم میں جو گوشت کا ٹکڑا ہے۔

حقیقی کو موت نہیں اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو بھی دوام رہے گا اس تقدیر پر الا ان تقطع قلوبھم میں استثنٰی ایسا ہوگا جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم بھن فلول من قراع الکتائب

ای ان کان فیھم فھو ذاك وھذا لیس بعیب فلا عیب فیھم اصلا

''اور ان میں کوئی عیب نہیں اس لئے کہ ان کی تلواروں کی دھار شمشیر زنی سے گر جاتی ہے اگر کوئی عیب ہوتا تو یہ ہوتا لہذا ان میں بالکل کوئی عیب نہیں''

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں جب کہ قلب ہلاک ہوجاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہذا دوام حسرت وارمان بھی دواماً ثابت ہے۔

حال یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ ورضوان حق کے (۱) لئے ہونے کا تو جو عمارات غیر تقویٰ رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے بانیوں کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس عمارت کی بناء تقویٰ اور رضوان (۲) پر ہو وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے۔ واللہ علیم اور اللہ تعالیٰ جاننے والے۔ الحمدللہ! بیان ختم ہوگیا۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔

والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اشرف علی (۱۳۵۵ھ)

---

(۱) ان کی عمارت تقویٰ کی بنیاد پر نہیں تھی اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی مقصود نہیں تھی (۲) جس عمارت کی بنیاد رضا الٰہی اور تقویٰ پر ہو۔

خلیل احمد تھانوی